دیکھئے میری باتوں میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

روشنی کی جانب.....

مصنف

محمد عفان عباسی

بفیض

جناب حضرت اقدس الحاج ماسٹر محمد شمشیر اعظم صاحب مدظلہ العالی

خلیفہ ومجاز بیعت

جناب حضرت اقدس الحاج ماسٹر محمد عباس خان صاحب دام ظلہ السامی

ناشر: مکتبہ مدنیہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب: روشنی کی جانب....

مصنف: مفتی محمد عفان عباسی

مصنف کا فون نمبر: 9931847198

ای میل: affansamar@gmail.com

فیس بک لنک: www.facebook.com/affuabbasi

ناشر: مکتبہ مدنیہ دیوبند

صفحات: 128

سن اشاعت: 2014

فہرست

انتساب

اُن لوگوں کے نام.........

☆ جو حق کے متلاشی ہیں!

☆ جو رسول کریم ﷺ کی شریعت کا منشاء
اور اس کا مزاج سمجھنا چاہتے ہیں۔

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

تقریظ عالی

مخدومنا المکرّم حضرت اقدس ماسٹر محمد شمشیر اعظم صاحب مداللہ ظلہ السامی

جوں جوں ہمارا زمانہ رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ مبارکہ سے دور ہوتا جا رہا ہے، توں توں فتنوں اور اسلامی تعلیمات پر یورشوں کی بوچھار بڑھتی چلی جا رہی ہے، آج کی نئی اور نوجوان نسلوں میں جہاں اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا صالح اور نیک جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، وہاں دوسری جانب کچھ لوگ ایسے بھی رونما ہو رہے ہیں جو اِن کالج و اسکول جانے والی نسل کو راہِ حق سے بہکانے کے لئے نِت نئے طریقوں کا استعمال کر رہی ہے۔

ایک شخص عرصہ سے نماز چھوڑے غافل بیٹھا تھا، اس کے کانوں میں حق کی پھونک ڈالی گئی اور وہ عملِ صالح کے جذبہ سے سرشار ہوا، نماز شروع کئے دو ہی دن گذرے کہ کچھ لوگ سایوں کی طرح اُن کے پیچھے پڑ گئے کہ تمہاری نماز درست نہیں ہے، تمہارے باپ دادا تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتے ہیں، یہ شرک ہے۔ یہاں کے لوگ زور سے آمین نہیں کہتے، یہ گناہ ہے، نبی ﷺ نے تو آٹھ ہی رکعات تراویح پڑھی ہے، تم بیس پڑھ کر بدعتی بنے ہوئے ہو۔ وغیرہ جیسے چند مسائل۔

اِن نوجوانوں میں چونکہ دین کا حقیقی علم نہیں، یہ تو قرآن وحدیث اور اسلاف کے نظریے و موقف سے بے خبر ہیں، اِن کے کچے ذہنوں میں یہ شبہات ڈالے گئے، چونکہ اِن کے پاس حقیقی علم موجود نہ تھا، قوت مدافعت نہ تھی، اور ورغلایا بھی

اِس انداز سے گیا کہ اُس نے سنّنِ مؤکدہ کو پس پشت ڈال دیا، کل تک اس کے سر پر ٹوپی تھی، لیجئے! ٹوپی بھی اُتری، آج بنا ٹوپی کے ہی نماز میں کھڑا ہے، اگر اُن سے پوچھ ڈالیں کہ ٹوپی کہاں ہے؟ تو جواب یہ کہ: نبیﷺ نے اِس کا کس حدیث میں حکم دیا ہے؟ رفع یدین بڑے زور و شور سے کر رہا ہے اور دوسروں کو اس کی تلقین بھی کہ: بخاری کی حدیث میں رفع یدین کا حکم ہے۔

حال یہ ہے کہ بندہ نہ تو بخاری شریف سے باخبر ہے، نہ حدیث کی ابجد سے واقف ہے، حدتو یہ کہ ''رفع یدین'' کا لفظی معنی بھی پتہ نہیں، فضائل اعمال کی دو لائن نہیں پڑھ سکتا، لیکن اُسے اتنی خبر ضرور ہے کہ اُس میں شرک و کفر کی بھر مار ہے، حدتو یہ کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی کتابیں بھی اُن کی تنقید سے بالاتر نہیں۔بس اسے یک طرفہ بات بتائی گئی کہ آج تک امت کا جس پر عمل رہا ہے، جس کو اسلاف کرتے آئے ہیں، وہ سب باطل اور غلط ہیں، تیسری بات یہ کہ یہاں تو عمل کرنے والے لوگ بہت تھے، وہ اِن میں گُم تھے، کوئی پہچان نہ تھی، لیکن وہاں اُنھیں نمایاں مقام ملنے لگا، یہاں عہدے اور مرتبے کا فقدان تھا، وہاں عہدوں سے نوازے جانے لگے، یہاں اُنھیں پوچھا نہ جاتا تھا اور وہاں گرمجوشی سے استقبال(Warm Welcome)

پھر اُن کے ذہنوں میں یہ باطل بات راسخ کی جاتی ہے کہ شریعت کا اصل معیار صرف صحاح ستہ ہے، اُن کی جرأتیں اس قدر بڑھادی جاتی ہیں اور اُنھیں اِس قدر گستاخ بنا دیا جاتا ہے کہ اُس دن میری تکلیف کی انتہاء ہوگئی جس دن کسی شخص نے یہاں تک کہہ دیا کہ: ابوحنیفہ (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے) تو پکے جاہل تھے۔میری نگاہوں میں رسول اللہﷺ کا وہ فرمان گھوم گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: جس نے میرے ولی (دوست) سے دشمنی کی، وہ مجھ سے جنگ کے لئے تیار

ہو جائے۔اور مجھے رسول اللہﷺ کے اس فرمان کی صداقت نظر آگئی جس میں آپؐ نے فتنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس امت کے اگلے لوگ اپنے پچھلوں پر لعن طعن کریں گے۔

میں خوف سے لرزنے لگا اور میرا دل اِن معصوم اور کچے ذہنوں کی روز بروز بڑھتی بربادیاں دیکھ کر کُڑھنے لگا، سبھوں کو بالمشافہ سمجھانا اور اُنھیں حق کی جانب بلانا بھی ناممکن اور دشوار۔ تحریری اعتبار سے مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس....

کہ........اسی درمیان عفان بابو کو ایک روز نظام شمسی اور کائنات کے بارے میں سائنسی تحقیقات کو اسلامی تعلیمات کے نکتۂ نظر سے سمجھا رہا تھا، ناگاہ میری نظر اُن کے بلاگ پر پڑی جو اِن ہی سُلگتے ہوئے اختلافی موضوعات سے متعلق تھی، گویا یہ میرے لئے اللہ کی جانب سے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، اُس وقت میرا داعیہ شدت اور بہت شدت اختیار کر گیا، سو میں نے عفان بابو سے کہا کہ: اِس وقت سب سے زیادہ ضروری ہے کہ اِس سلسلہ میں عام فہم زبان میں اِن نوجوان نئ نسل کے لئے ایسی بنیادی باتیں لکھی جائیں جو اِن کے ذہن میں ڈالے جانے والے شبہات و وساوس کا جواب ہو، اور جو لوگ اِن کے چنگل سے بچے ہوئے ہیں، اُنھیں؛ اور اِس میں مبتلا ہوگئے لوگوں کو قرآن و حدیث کا صحیح مطلب بتایا جائے جس سے اُن کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو، اور اُن کے اندر قرآن و حدیث کے علم سے اپنی ذاتی مدافعانہ قوت پیدا ہو جس سے وہ اِن یورش و شورش پسندوں کے یلغار سے محفوظ رہ سکیں۔

ماشاء اللہ! عفان بابو نے اِس کی تعمیل میں ہماری توقعات سے زیادہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، جس کے نتیجہ میں یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، میں تو بہر حال کسی لائق نہیں، بس یہ سب ہمارے حضرت شیخ ماسٹر محمد عباس خان صاحب

مدظلہ العالی کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

میں پڑھنے والوں سے مؤدبانہ گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے اپنی نگاہوں سے تعصب کا پردہ ہٹالیں اور خالص اللہ کی رضاء کے لئے اس کا مطالعہ کریں کہ آخر تو ہمیں اُسی کے پاس جانا ہے اور ہر چیز کا آخری فیصلہ تو بہرحال اللہ جل شانہ کے پاس ہے۔ دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عفان بابو سے دین کی خوب خوب خدمت لیں اور ان کی صلاحیت وصالحیت میں روز افزوں ترقیات عطاء فرمائیں۔ آمین!

یکے از غلامان ماسٹر محمد عباس خان صاحب مداللہ ظلہ العالی

محمد شمشیر اعظم

ادا کیوں کر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ...

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدُ للّٰہ الذی جَعل فِی کُل زمان فترة من الرُسلِ بَقایا مِن اھلِ العِلمِ،یدعُون مَن ضلّ اِلی الھُدیٰ،ویصبِرون منھم علی الأذیٰ،یحیون بکتاب اللہ تعالیٰ المَوتیٰ،ویبصرون بنُور اللّٰہِ اھلَ العَمیٰ،فکَم مِن قَتیل لابلیسَ أحیوہ،وکم من ضالّ تائِہ قد ھدوہ،فما أحسن أثرھم علی النّاس،وما أقبح اثرُ الناس علیھم،یُنفون عن کتاب اللّٰہ تَحریفَ الغالین وانتحال المُبطلین وتأویل الجاھلین الذین عقدوا الویة البدعة واطلقوا اعان الفِتة،فھُم مختلفون فی الکتاب مخالفون للکتاب،مجمعون علیٰ مفارقةِ الکِتاب،یقولون علی اللّٰہ وفی اللّٰہ وفی کتاب اللّٰہ بغَیر عِلم ،یتکلمون بالمتشابہ من الکلام ویخدعون جھّال الناس بما یشبھون علیھم،فنعوذُ باللّٰہ من فتنة المضلّین.فنحمَدہ ونشکرہ علی مامَنح من عطایاہ أباح،ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ شھادةً نرجُو بھا الفوزَ والنّجاح،و نشھدُ انّ مُحمداً عبدُہ ورسولُہ صلّی اللّٰہ علیہ صلاةً تقُوم فتدُوم مما ھبت الریاح وما تعاقب الجدیدان واختلفَ المساءُ والصباحُ.

حجۃ الاسلام حضرت علامہ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں ایک بہت بڑا اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: سیدھے راستے اور اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اصل دو چیزیں ہیں اور دونوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے: ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب و سنت اور شرعی دلائل کو مقدم رکھا جائے اور اسی کے حکم پر عمل کیا

جائے۔دوسری یہ کہ تمام ائمہ اسلام اور علمائے حق سے اچھا گمان اور محبت و ارادت رکھنی چاہیئے اور اُن کے حقوق و مرتبے سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔یہی وہ دو اصول ہیں جن کے توازن اور تناسب کو اعتدال کے ساتھ ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں۔

بد بختانہ لوگوں نے ہمیشہ اسی میں افراط و تفریط کی ہے، دونوں میں سے صرف ایک کے ہی ہو کر رہ گئے اور ایک کو بُھلا بیٹھے۔ایک جماعت تو وہ ہے جس نے اماموں اور اکابرین و بزرگانِ دین کو ہی شریعت قرار دیا اور قرآن و سنت کو ان کے تابع بنا دیا۔

دوسری جماعت وہ ہے جس نے شرعی نصوص (قرآن و سنت) کو مقدم رکھنے کا یہ مطلب سمجھا کہ جہاں کسی اہلِ علم کا کوئی قول بظاہر کسی آیت یا حدیث کے خلاف نظر آیا، بلا تأمل (بغیر سوچے سمجھے) تضلیل و تکفیر (گمراہ اور کافر کہنے) پر آمادہ ہو گئے اور جھٹ سے حکم لگا دیا کہ یہ منکرِ شریعت ہے۔اگر چہ اُس عالم نے پوری زندگی شریعت کے علم و عمل میں بسر کر دی ہو۔

اِن میں سے پہلی جماعت کو محبت و اتباع کے نقاب میں گمراہ ہونا پڑا، اور دوسری جماعت نے بغض و عناد اور دشمنی میں اپنے آپ کو گمراہ کیا۔ ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں، یا بہت زیادہ محبت یا بہت زیادہ دشمنی نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔

لیکن اہلِ حق کی صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) اِن دونوں سے الگ ہے۔اہلِ حق ہمیشہ شریعت اور کتاب و سنت کو سب سے اول درجہ دیتے ہیں اور اس تمام کائنات ہستی میں صرف شریعت کی ہی اتباع کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ اہلِ علم اور ائمۂ اسلام سے حسنِ ظن و عقیدت بھی رکھتے ہیں، اُن کے جو اقوال بظاہر کتاب و

سنت کے خلاف نظر آتے ہیں، اُن میں میانہ روی اور اعتدال سے کام لیتے ہوئے اُس کی تحقیق کرتے ہیں اور تعبیر کی ایسی راہ تلاش کرتے ہیں جو قرآن و سنت کے موافق ہو۔

پہلی جماعت تو بالاتفاق گمراہ ہے ان کا حال وہی ہے جس کو اللہ نے اِس طرح بیان کیا: **اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله.** کہ انھوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو اپنا رب بنا ڈالا۔

لیکن...... اِس دوسری جماعت کا بھی عجیب حال ہے، اِس نے موجودہ زمانہ میں ایک طوفان اور واویلا مچا رکھا ہے کہ آج تک جس چیز پر عمل ہو رہا تھا، ائمۂ حدیث اور فقہاء کرام نے جس میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی، وہ سب کی سب غلط ہیں۔

اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف ہم ہی صحیح حدیثوں پر عمل کرنے والے ہیں، ہم صرف قرآن و سنت کو مانتے ہیں، اس کے علاوہ کسی کی تقلید و پیروی نہیں کرتے، ہمارے علاوہ جو لوگ ہیں وہ سب کے سب شرک اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یہ تو آنے والے صفحات بتائیں گے کہ صحیح حدیثوں پر کس کا عمل ہے اور ضعیف و مجروح حدیثوں پر کس کا؟ اور جہاں تک پیروی اور تقلید کی بات ہے تو ہم میں اور اِن میں فرق یہ ہے کہ ہم احادیث و فقہ اور شریعت اسلامی کے علوم کے اماموں کی تقلید و پیروی کرتے ہیں اور یہ لوگ اِس زمانے کے اپنے نام نہاد مفتیوں کی۔

بلا جھجک عرض ہے کہ اس جماعت کا ''عمل بالحدیث'' (حدیثوں پر عمل کرنے) کا دعویٰ صرف دعویٰ کی ہی حد تک محدود ہے، اِن کے یہاں حق و باطل (صحیح اور غلط) کا معیار چند اختلافی مسائل کے علاوہ کچھ نہیں مثلاً: امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں؟ رکوع اور سجدہ کے وقت ہاتھوں کو اٹھایا جائے یا نہیں؟ آمین

بلند آواز سے کہی جائے یا آہستہ؟ نماز میں ہاتھوں کو کہاں باندھا جائے؟ تراویح بیس رکعات ہیں یا آٹھ؟ وغیرہ۔

اِن چند گِنے چُنے مسائل کے علاوہ انھیں حدیثوں پر عمل کرنے سے کوئی مطلب نہیں، البتہ اِن مسائل میں اِن کی دلچسپیاں ایسی ہیں جیسے یہ فروعی مسائل نہیں، بلکہ یہی کفر و ایمان کی بنیاد ہو۔

اگر یہ لوگ اپنے عمل بالحدیث (حدیث پر عمل کرنے) کے دعویٰ میں سچے ہوتے اور اِن کے دلوں میں سنتوں کو زندہ کرنے کا جذبہ ہوتا تو وہ رسول کریم ﷺ کی ایک ایک سنتوں پر مر مٹتے، جب کہ روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ انھیں سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، معاملات و معاشرت اور دوسروں کے ساتھ سلوک و رویہ سے متعلق احادیث سے کوئی سروکار اور مطلب نہیں، ذرا دیکھئے میں ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں:

سوال: کوئی شخص صرف فرض نماز ادا کرے اور سنت مؤکدہ یا غیر مؤکدہ چھوڑ دے تو اللہ کے یہاں اس سنت کو چھوڑنے کا کیا مؤاخذہ ہوگا؟

جواب: سنتوں کی وضع رفع درجات کے لئے ہے ترکِ سنن سے رفع درجات میں کمی رہتی ہے، مؤاخذہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ (یعنی سنتیں انسان کا درجہ بڑھاتی ہیں، سنتوں کو چھوڑ دینے سے درجہ میں کمی آئے گی لیکن پکڑ نہیں ہوگی)

ملاحظہ کیا آپ نے؟ یہ اُن لوگوں کا کہنا ہے جو حدیث پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور سنتِ مؤکدہ (جن سنتوں کی حدیث میں تاکید آئی ہے اور نبی ﷺ نے اُنھیں اکثر و بیشتر معمول کی طرح ادا فرمایا ہے) کو چھوڑ دینے سے کوئی حرج نہیں۔ فیاللمصیبۃ ویاللرزیۃ۔

اِن کا اصل منشاء کیا ہے؟ یہ ان کے دلوں کی بات ہے، لیکن اُن کے عمل سے یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا حقیقی مقصد مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا کرنا ہے، اسی لئے یہ لوگ چُن چُن کر صرف ایسی حدیثوں کو اپنی بحث اور اپنے مناظرہ کا محور (Center.or.Axix) بناتے ہیں جن میں ائمۂ کرام نے اختلاف کیا ہے۔

افسوس! جزئی مسائل کے اندر اختلاف اور باطل غرور نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہونچایا ہے، کسی اور چیز نے اتنا نقصان نہیں پہونچایا، اس سے عملِ صالح (اچھے عمل) کی اہمیت جاتی رہی، سارا دار و مدار صرف چند مزعومہ سنت و عقائد پر آ کر رہ گیا، ایک شخص صرف اس خود ساختہ سوچ اور زعم میں کہ: میں الف سے یاء تک سنتوں کا مجسمہ ہوں؛ تمام مسلمانوں کو حقیر اور گمراہ کہہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عملِ صالح، ایثار اور حب فی اللہ (اللہ کے لئے محبت کرنا) کوئی چیز ہی نہیں۔

حیرت اور مجھے بہت حیرت ہے کہ ایک شخص تقویٰ وطہارت میں کتنا ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ ہو، لیکن اگر کسی ایک جزئی مسئلہ میں بھی وہ اُس کے مخالف ہوا تو اس کی ساری عمر کی کمائی رائیگاں اور برباد گئی، وہ عمر بھر کے ایمان اور نیک عمل کے باوجود گمراہ کا گمراہ ہی رہا۔ جس کلمہ کے ایک بار اقرار کر لینے کے بعد اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان اور قاتلِ حمزہؓ وحشی کا خون حرام ہوگیا تھا، اگر ابوجہل بھی اس کلمہ کا اقرار کر لیتا تو اس کی ساری عمر کا کفر و طغیان (سرکشی) مٹ کر رہ جاتا، آج..... ساری عمر ایمان و عملِ صالح میں بسر کر دیجئے، لیکن پھر بھی مؤمنوں کے گروہ میں شامل ہونے کا حق نہیں۔ افسوس! چودہ سو برس گذر چکے لیکن حق و باطل کی گتھی نہ سلجھ سکی۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کا پاک دَور ختم ہوا تو اس کے بعد فتنے و فساد اور بدعات و محدثات کی شروعات ہوئی، امت میں اختلافی

مسائل بڑھنے لگے، ردوکد اور بحث ومناظرہ کا آغاز ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز لوگوں کی توجہ اسی کی طرف بڑھنے لگی، رفتہ رفتہ عمل سے طبیعتیں بے پروا ہوگئیں، حتیٰ کہ آج........حال یہ ہے کہ اسلام وایمان کا سارا مدار محض چند اختلافی مسائل پر ہے، اور ہر شخص اِن ہی کے غرور و پندار میں مست رہتا ہے، عمل کی درستگی اور تقویٰ وطہارت کی اہمیت یک قلم فراموش کردی گئی ہے، قریب ہے کہ: اسلام کے ارکان وشرائط سے عملِ صالح کا رکن اس طرح ختم ہوجائے کہ گویا عملِ صالح کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

ساری کھوج وکرید اور ساری تلاش صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ: فلاں شخص رفع یدین کرتا ہے یا نہیں؟ فلاں شخص زور سے آمین کہتا ہے یا نہیں؟ فلاں بندہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء تو نہیں مانگ لیتا؟ فلاں شخص کہیں بیس رکعات تراویح تو نہیں پڑھ لیتا؟ (گویا ان کی نگاہ میں بیس رکعات پڑھ لینے والا بے چارہ گمراہی کے دلدل میں پھنس ہی گیا) **فیا للعجب!**

اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے؟ اس کی معاشرت کیسی ہے؟ اس کے اخلاق کیسے ہیں؟ اللہ ورسول کی محبت میں اس کے اندر جان ومال لگا دینے کا جذبہ ہے کہ نہیں؟ وہ تقویٰ کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ معاملات میں اس کا کیا حال ہے؟ لین دین میں اس کے اندر سچائی اور دیانت ہے کہ نہیں؟ وہ ایک شفیق باپ، رفیق بھائی، وفادار شوہر، رحیم وغمگسار پڑوسی ہے یا بے رحم وجود، بے حس پتھر اور موذی مخلوق؟ ہماری فکر یہ نہیں ہوتی کہ وہ نماز میں نہیں آتا تو اسے نماز کی طرف بلائیں، وہ روزہ سے بچتا ہے تو اسے روزہ کی تلقین کریں، وہ زکوٰۃ نہیں دیتا تو اسے زکوٰۃ کی ترغیب دیں، اس کے اخلاق اچھے نہیں ہیں تو اسے رسول کریم ﷺ کے اخلاق سے مطلع کریں۔ دیکھا تو اتنا جاتا ہے کہ جو لوگ نماز پڑھ

رہے ہیں اُن کے دل میں شک ڈالا جائے کہ تمہاری نماز درست نہیں، اُنھیں یہ باور کرایا جائے کہ چودہ سو سالوں سے تمام مسلمان غلط ہی عمل کررہے تھے۔ سبحان اللہ! گویا کہ ان کے نزدیک اصل ایمان واسلام کا سارا دار ومدار محض رفع یدین، آمین بالجہر، آٹھ رکعات تراویح، وغیرہ ہی ہیں، باقی کی پوچھ تو اللہ کے یہاں ہوگی ہی نہیں۔ معاذ اللہ!

اِن ساری باتوں میں (جو دین وشریعت کی روح اور اصل ہیں، جو چیزیں زندگی میں نہ ہوں تو آدمی صرف نام کا مسلمان ہے) اس کا حال کچھ بھی ہو، لیکن اگر وہ چند اختلافی مسائل میں ہمارا ہم آہنگ اور موافق ہے تو پھر.....ہمارے نزدیک اِس روئے زمین پر اس سے افضل اور بزرگ ہستی کوئی ہے ہی نہیں۔ یہی گمراہی یہود کی تھی: **وقالُوا لَن تَمَسّنا النارُ الا أياما مّعدُودة.** وہ کہتے تھے کہ اگر ہمیں دوزخ میں آنا بھی ہوگا تو بس چند دنوں کی بات ہے۔ جنت تو ہمارے باپ دادا کا گھر ہے۔ یہ غرور کا فتنہ بہت ہی بڑا فتنہ ہے، اور آج.....مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی اِس سے کھلی جارہی ہے۔ **ولكن أكثر الناسِ لا يَعقِلون.** لیکن اکثر لوگ سمجھ سے دور پڑے ہوئے ہیں۔

بے تکلف عرض ہے کہ میرے خیرخواہ ومربی، حضرت والد صاحب مدظلہ العالی کے خلیفہ ومجاز بیعت حضرت ماسٹر محمد شمشیر اعظم صاحب مدظلہ العالی ایک دن مجھے اِس کائنات کے طول وعرض کو سائنسی اعتبار سے سمجھا رہے تھے، انٹرنیٹ پر ہی گھومتے ہوئے اُنھوں نے میرا بلاگ دیکھا، عناوین کچھ اِن ہی مختلف فیہ مسائل کے تھے، تھوڑی دیر کے مطالعہ کے بعد انھوں نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا:

''شورش کے اس زمانہ میں؛ جب کہ رسول کریم ﷺ کا فرمان صادق آرہا ہے کہ: آدمی صبح کو مؤمن جاگے گا لیکن وہ شام کو اس حال میں گھر واپس آئے گا کہ

اس کا ایمان اس سے رخصت ہو چکا ہوگا۔ایک طرف تو لوگوں کے اندر سے اچھے اعمال اور ایمانی کاموں کا جذبہ مرمٹ رہا ہے،اور جو لوگ اِن دینی امور میں مشغول ہیں،اُن کے پیچھے دوطرح کی جماعتیں اُنھیں سیدھے راستہ سے ہٹانے کے لئے پِل پڑی ہوئی ہیں،ایک شیاطین کا وہ گروہ جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے،دوسرے کچھ وہ لوگ جو دینی امور میں مشغول رہنے والوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے ہیں کہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے سے نماز نہیں ہوتی، بلند آواز سے آمین کہنا واجب ہے، سینے پر ہاتھ نہ باندھنے سے گناہ ہوتا ہے اور اماموں کی تقلید و پیروی کرنا کفر وشرک ہے وغیرہ وغیرہ۔

الحمدللہ! کتابیں تو اس سلسلہ میں تعداد سے زیادہ آچکی ہیں،لیکن ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو عام ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہے اور وسوسہ ڈالنے والے لوگوں کے وسوسے،اسی طرح وہ بنیادی سوالات جو تقلید اور چند گِنے چُنے اختلافی مسائل کے تعلق سے پیدا ہوتے ہیں،اُن کا جواب اور اُن سب کی ایسی تشریح پر مشتمل ہو جس کو بہت ہی کم پڑھا لکھا انسان بھی سمجھ سکے، کیونکہ مقولہ مشہور ہے: An Ideal teacher always comes to the level of the students کہ اچھا استاذ وہ ہے جو طالب علم کے معیار پر اُتر کر بات کرے‘‘۔

اب میرے پاس اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اِس حکم کی تعمیل کرتا،سو میں نے اللہ کی توفیق سے اور حضرت ماسٹر صاحب اور حضرت والد صاحب مدظلہما العالی کی دعاؤں کی چھاؤنی میں قلم سنبھالا، میں نے کوشش کی کہ کسی مسئلہ کے اندر بہت زیادہ تفصیل میں نہ جاؤں، کیونکہ ہر عام ذہن تفصیل کو برداشت نہیں کرسکتا، بڑی بڑی کتابوں میں سارے مسائل کی تفاصیل

موجود ہیں، جو باتیں بہت ضروری تھیں،اُنھیں میں نے عام اور آسان انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے،اِن نام نہاد عمل بالحدیث کا دعویٰ کرنے والوں کے موقف کی وہی دلیلیں ذکر کی ہیں جو اُن کے یہاں مسلم ہے اور مانی جاتی ہے، میں نے اُن لوگوں کی ساری دلیلیں ذکر نہیں کی، بلکہ صرف وہ دلیلیں پیش کی ہے جسے اُن کے یہاں وزنی مانا جاتا ہے اور وہ اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں،وہ ساری حدیثیں چھوڑ دی ہیں جن میں بالاتفاق کلام ہے اور وہ اس لائق نہیں کہ اُنھیں کسی بھی طرح سے دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکے،اس لئے یہ شبہ نہ ہو کہ ساری دلیلیں کیوں نہیں نقل کی؟ پھر میں نے اُن ہی احادیث پر کلام نقل کیا ہے جس پر واقعی کچھ کلام کیا گیا، بہت سی حدیثیں ایسی بھی ہیں جن پر کلام تو کیا گیا ہے لیکن اس میں کوئی وزن نہیں،تو میں نے ایسے کلام کو اختصار کے پیشِ نظر چھوڑ دیا ہے۔حوالہ جات کے تعلق سے ذہن نشیں رہے کہ آج کل اکثر لوگ بیروت کے نسخوں کا حوالہ چاہتے ہیں جو جلد اور صفحہ نمبر کے بجائے حدیث نمبر کے اعتبار سے ہو،سو میں نے عموماً یہی کوشش کی ہے اور ملک بیروت میں چھپے ہوئے نسخوں سے حوالہ پیش کیا ہے۔

اِسے لکھنے کا میرا سب سے بڑا مقصد رسول کریم ﷺ کا فرمان ’’الدِّینُ النَّصِیحَۃُ‘‘ (دین خیر خواہی کا نام ہے) ہے، میں سمجھتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر اِسے پڑھ کر کوئی ایک شخص بھی حقیقت کو سمجھ لے اور یہ کتاب اس کے سیدھے راستے پر جم جانے کا سبب بن گئی تو یہ میرے لئے دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوگی۔

یہ کتاب اُن لوگوں کی بصیرت کے لئے کافی ہے جو حق کے متلاشی ہیں، جو حق اور سیدھی راہ کو سمجھنا اور اس پر چلنا چاہتے ہیں، جو تاریک اور خطرناک بیابان سے نکل کر روشنی کا سفر کرنا چاہتے ہیں، جنھیں یہ فکر ہے کہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونا

ہے، جنھیں یہ احساس ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے وصال کے بعد امت کو ابوبکرؓ وعمرؓ کی پیری کا حکم فرمایا ہے، جن کے اندر امت کا فکر ہے، جن کے دماغ میں ملتِ مرحومہ کی فلاح و بہبودگی کا تصور ہے، جو چاہتے ہیں کہ امت اختلافی مسائل میں الجھنے کے بجائے اپنا اصلی مقصد پہچانے۔ ایسے لوگ یقیناً چشمِ بصیرت رکھنے والوں میں سے ہیں جن کے لئے گھاس کی ایک پتی بھی صحیفۂ فطرت کا درجہ رکھتی ہے۔

البتہ......وہ لوگ جو یک طرفہ سوچ رکھتے ہیں، جو حقیقت کا مطالعہ حقیقی نظر سے نہیں، بلکہ عصبیت والی نگاہوں سے کریں گے، جو پڑھنے سے پہلے ہی یقین کر چکے ہوں گے کہ وہی گھسی پٹی باتیں جو صدیوں سے چیخی جارہی ہے؛ ہوں گی، ایسے لوگوں کے لئے ایک رسالہ کیا چیز ہے؟ اُن کے لئے تو کتب خانے بھی ناکافی ہیں۔ **مثل الذین حُمِّلوا التّورٰة ثم لم یَحملُوها کمَثل الحِمار یحملُ أسفَارا.** (جن لوگوں کو توریت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا، پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا، اُن کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے) میں ایسے لوگوں سے مخاطب نہیں ہوں، اِنھیں چاہئے کہ بس اب کتاب بند کردیں۔

لیکن جو لوگ حقیقت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، میں انھیں حق کی دعوت دیتا ہوں، ڈرتے اور جھجکتے ہوئے نہیں، بلکہ پکارتے اور للکارتے ہوئے:

دیکھئے میری باتوں میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

محمد عفان العباسیؔ

31847198

شریعت کو سمجھنے کے لئے دو چیزیں

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العلمین ،الرحمٰن الرحیم، ملٰک یوم الدین ،ایاک نعبد وایاک نستعین ،اِهدنا الصراط المستقیم،صراطَ الذین انعمتَ علیهم،غیرِ المغضوبِ علیهم ولا الضالّین. آمین.

تمام تعریف وتوصیف اُس اللہ کے لئے جو ساری دنیا کا رب ہے، جس کی رحمت عام اور تام (پوری پوری) ہے، جو قیامت کے دن کا مالک ہے۔ اے اللہ! ہم تیری ہی پرستش (عبادت) کرتے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، ہمیں سیدھا راستہ دِکھا، ان لوگوں کو راستہ دِکھا جن پر تو نے انعام کیا، اُن کا راستہ نہیں جن سے تو غصہ ہوا اور نہ ہی گمراہوں کا راستہ۔ آمین۔

اس سورہ کے اندر غور کرنے کا مقام ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے سیدھا راستہ مانگنے کے لئے یہ دعاء بتائی کہ: ہمیں اُن لوگوں کو راستہ دِکھا جن پر تو نے انعام کیا۔ یہ دعاء نہیں بتائی کہ: ہمیں قرآن کا راستہ دِکھا، یا ہمیں رسول کا راستہ بتا۔ بلکہ اُن لوگوں کا راستہ اختیار کرنے کا حکم فرمایا جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی نبیوں، صدیق (سچے لوگوں) اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے والوں اور نیک لوگوں کا راستہ۔ پھر اللہ نے یہ انداز بھی اختیار نہیں فرمایا: صرف نبیوں کی راہ اختیار کرو۔ کیونکہ نبی ﷺ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے والے نہیں، نہ ہی آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا نبی اور رسول آسکتا ہے، اس لئے سیدھا راستہ نبیوں کے علاوہ جن لوگوں سے حاصل ہوسکتا تھا، انھیں بھی اللہ نے اِس میں شامل فرمادیا، تاکہ یہ امت اُن لوگوں کی راہ پر چل کر ہمیشہ ہمیش سیدھی راہ پر رہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ عز وجل نے انسانوں کو سیدھی راہ معلوم کرنے کے لئے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، بلکہ کچھ خاص انسانوں کا پتہ بتایا، اور حدیث میں بھی تو یہی آیا کہ: میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، بہتر فرقہ دوزخی ہوگا، صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔ رسول کریم ﷺ کے شیدائیوں نے دست بستہ عرض کیا: یارسول اللہ! جنت میں جانے والے فرقہ کا پتہ تو بتائیں؟ رسول کریم ﷺ نے رہنمائی کی: ما أنا علیہ واصحابی۔ وہ فرقہ جو میرے اور میرے صحابہ کی راہ پر چلے گا۔ ترمذی (2641)

اس خاص انداز میں شاید آپ ایک اشارہ سمجھ رہے ہوں گے، یقیناً اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: اِنسانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے صرف کتابیں اور روایتیں ہی کافی نہیں، بلکہ تعلیم وتربیت کی اصل روح اللہ والے لوگ اور اُس کے نیک بندے ہیں۔ کیونکہ کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں، آدمی تو، آدمی بناتے ہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دنیا کے تمام کاروبار میں نظر آتی ہے، صرف کتاب پڑھ کر نہ کوئی درزی بن سکتا ہے، نہ کوئی کپڑا بُننا سیکھ سکتا ہے، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث کا صرف مطالعہ کر لینا انسان کی تعلیم اور اَخلاقی تربیت کے لئے کافی نہیں ہے، یہ تعلیم وتربیت اور اخلاق کیا بنا سکے گی، یہ تو سراسر ہلاک کر دینے والی چیز ہے، جب تک کہ کسی ماہر محقق سے حاصل نہ کیا جائے۔

مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ قرآن وحدیث کے معاملہ میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس مغالطہ میں پھنسے ہوئے ہیں کہ: صرف قرآن وحدیث کا ترجمہ اور تفسیر دیکھ کر انسان قرآن و حدیث کا ماہر ہوسکتا ہے، جب کہ یہ عام

عقل (Common sense) کے بالکل خلاف ہے۔ غور کریں! اگر صرف کتابیں ہی کافی ہوتی تو کیا ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کا سلسلہ جاری فرماتا، تب تو خانۂ کعبہ کے اوپر جبریل امینؑ کے ذریعہ قرآن شریف رکھوادی جاتی اور کسی ہاتفِ غیبی سے یا کسی خط کے ذریعہ مطلع کر دیا جاتا کہ: یہ اللہ کی کتاب ہے، اس پر عمل کرو۔ اُس وقت نہ تو قبیلوں میں کوئی اختلاف ہوتا، نہ کوئی کسی کا دشمن بنتا، نہ رسول کریم ﷺ کو اذیتیں جھیلنی پڑتی، یہ کام تو بہت آسان تھا۔

لیکن نہیں! پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا خدا اِس حقیقت سے خوب خوب باخبر تھا کہ: انسانوں کی اِصلاح وصلاح کے لئے صرف کتاب کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے ''رجال'' (اللہ کے نیک بندوں) کی بھی ضرورت ہے۔ یعنی دین کو سمجھنے کے لئے کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ رجال اللہ کی بھی ضرورت ہے، اور ایسی ویسی ضرورت نہیں بلکہ سخت سے سخت ترین بلکہ ناگزیر ضرورت۔

ذرا اِس سے آگے پڑھیں تو بات صاف ہوجائے گی: **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین**. الٰہی! ہمیں ان لوگوں کا راستہ نہ دِکھا جن پر تو نے اپنا غصہ نازل کیا، اور نہ گمراہ لوگوں کا۔

آیئے ذرا قرآن سے ہی سوال کریں کہ: وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ نے اپنا غصہ اتارا؟ تو قرآن نے خبر دی اور اعلان کرتے ہوئے سنایا: **الم تر الی الذین تولوا قوما غضب اللہ علیھم. مجادلہ** (14) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس قوم سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے اپنا غضب نازل کیا؟ یعنی منافقین یہود سے دوستی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ''حضرت حاکمؒ نے ''مستدرک'' میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھئے کہ یہود پر اللہ کا غضب اور اس کا غصہ کیوں نازل ہوا؟ قرآن نے

خبردی:أفکلما جاء کم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم،ففریقا کذبتم وفریقا تقتلون.بقرہ(87)جب بھی تمہارے پاس اللہ کا پیغمبرؑ تمہاری خواہش کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تو تم نے تکبر کی اور تم میں سے اک فریق نے انھیں جھٹلایا اور ایک فریق نے اللہ کے رسولوں کو قتل کر دیا۔

بات اب بالکل صاف ہوگئی کہ یہود نے اللہ کے رسولوں اور پیغمبروں (رجال اللہ) سے دشمنی کی تو اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔

اب اس بات کو یہیں رکھ کر آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ: وہ لوگ کون ہیں جن کو اللہ نے گمراہ کہا ہے؟ رسول اللہ ﷺ وادی القریٰ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ!''مغضوب علیھم'' (جن پر اللہ نے غصہ اتارا) کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہود۔اس نے سوال کیا: ضالین (گمراہ) کون ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: نصاریٰ۔شعب الایمان(4020)

نصاریٰ گمراہ کیوں ہوئے؟ اللہ نے اِس کا بھی جواب دیا:ولما جاء ھم رسول من عند اللہ مُصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتو الکتاب ، کتابَ اللہِ وراءَ ظھورھم کأ نھم لا یعلمون.بقرہ (101) اور جب ان کے پاس اللہ کا رسول آیا،ان ہی لوگوں کی کتابوں کی تصدیق کرتے ہوئے تو اہلِ کتاب میں کے ایک فریق (نصاری) نے اللہ کی کتاب کو اپنے پیچھے یوں ڈال دیا جیسے وہ لوگ کچھ جانتے ہی نہیں۔

یعنی نصاریٰ کو اللہ نے گمراہ اس لئے کہا کہ انھوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا، یہود پر اللہ غصہ ہوئے،اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ والوں کو قتل کیا۔بات مکمل ہوگئی کہ: ہدایت اور سیدھے راستہ پر رہنے کے لئے کتاب اللہ اور رجال اللہ (اللہ والے لوگ) دونوں ہی ضروری ہیں اور بہت ہی ضروری۔اگر کوئی شخص صرف

کتاب اللہ کو لے لے اور رجال اللہ کو چھوڑ دے تو وہ یہود کی طرح گمراہ ہو جائے گا،اگر کسی نے رجال اللہ کو پکڑا مگر کتاب اللہ کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا تو وہ نصاریٰ کی طرح گمراہ ہو جائے گا۔

ذرا ٹھہریئے! اِس تفصیل سے تو ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے، ذرا ایک بار یہ حدیث تو پڑھیں:لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر و ذراعا بذراع حتی لو دخل احدُھم جحر ضب لسلکتُموہ.قلنا:یا رسولَ اللہ! الیھود والنصاریٰ؟قال:فمن؟بخاری (3456) تم ہر ہر معاملہ میں اپنے سے پہلے والوں لوگوں کی راہ پر چلو گے، حتیٰ کہ اگر اُن پہلے والے لوگوں میں سے کوئی شخص گوہ کی سوراخ میں داخل ہوا ہو گا تو تم بھی اسی راہ پر چلو گے۔ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا یہود و نصاری (کی بات کر رہے ہیں)؟ تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا: تو اور کس کی بات؟ (ہاں! انھیں لوگوں کی راہ پر تم لوگ چلو گے)

اس حدیث میں رسول کریم ﷺ نے پہلے ہی خبر دے دی کہ: یہ امت ہر معاملہ میں یہود و نصاریٰ کی روِش اختیار کرے گی، چنانچہ جس طرح یہودیوں نے اللہ والے لوگوں ،نبیوں ، رسولوں اور بزرگانِ دین کو قتل کیا اور اُن کی بے حرمتی کی۔اِسی طرح کچھ لوگ اِس امت میں بھی ہیں جنھوں نے رجال اللہ کو، اللہ کے ولیوں اور سلف صالحین کو پیچھے ڈال رکھا ہے، جو حضرت عمرؓ کے فیصلہ کو نہیں مانتے، انھیں حضرت عائشہؓ کی تفسیر نہیں بھاتی، انھیں سلفِ صالحین کا طریقہ گمراہی معلوم ہوتا ہے۔وہ لوگ صرف کتابوں کے بل بُوتے پر محدث و فقیہ کہلاتے ہیں، یقیناً ایسے لوگ گمراہ ہیں۔

اس امت کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ رکھا ہے، انھوں نے رجال اللہ یعنی اللہ کے نبیوں ،، ولیوں اور بزرگانِ دین کو ہی معبود

بنالیا،وہ اُنھیں سجدہ بھی کرتے ہیں،اُن کے نام پر ذبح بھی کرتے ہیں،اُن سے اولاد بھی مانگتے ہیں۔ یہ لوگ بھی گمراہ ہیں۔

لیکن اِن سب کے باوجود.....ایک فرقہ ہے،جونجات پانے والا ہے،جوحق اورسیدھے راستہ پر ہے،جو "**انعمت علیھم**" کے راستہ پر ہے۔یہ وہ فرقۂ ناجیہ ہے جو رسول اللہﷺ اور اُن کے پاک اصحاب کے راستہ اور اُن کی روش پر ہے۔اِن کی پہچان یہ ہے کہ: یہ لوگ کتاب اللہ (اللہ کی کتاب اور اُس کے احکامات) کو رجال اللہ (اللہ کے نیک بندوں) کے ذریعہ سمجھتے ہیں،جن کے یہاں رجال اللہ کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ: کتاب اللہ کے اصول اورقواعد پرلوگوں کو جانچا اور پرکھا جائے،اگر یہ لوگ اُن اصولوں پر صحیح آتے ہیں تو یہ رجال اللہ ہیں،اور جب یہ رجال اللہ کے صحیح معیار پرآجائیں تو اِن سے کتاب اللہ اورسنت رسول اللہﷺ سمجھی جائے۔

یہی سیدھا اوراعتدال والا راستہ ہے،یہی حق ہےاور یہی اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پراللہ نے انعام اوراپنا فضل فرمایا ہے۔تو آیئے اِسی راہ پر چلیں،کیونکہ یہی نجات کی شاہ راہ ہے۔

تقلید کا مطلب

ہر مسلمان پر دراصل اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت فرض ہے،بلکہ رسول کریمﷺ کی اطاعت بھی اس لئے کی جاتی ہے کہ آپﷺ نے اللہ کے احکام کی تشریح فرمائی ہے،ورنہ حقیقی اطاعت کے لائق اللہ کے سوا کوئی نہیں،لیکن ظاہر ہے کہ ہر عام آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ سے بلا واسطہ یا رسول اللہﷺ سے بلا واسطہ تمام احکام معلوم کرسکے،بلکہ اس کے لئے اُسے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

پھر قرآن وحدیث میں بہت سے احکام تو ایسے ہیں جو قطعی ہیں جیسے نماز کی فرضیت،جھوٹ و زناء کی حرمت (حرام ہونا) وغیرہ،اس طرح کے مسائل نہ تو اجتہاد کا محل ہیں نہ ہی تقلید کا۔

لیکن....قرآن وسنت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جس میں کوئی پوشیدگی اورظاہری طور پر دلیلوں میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے،جیسے قرآن میں ہے: **والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثة قروء.** کہ مطلقہ عورتیں اپنے آپ کوتین "قروء" روکے رکھیں۔اب لغت میں "قروء" کا معنیٰ حیض کے بھی ہیں اور طہر (پاکی) کے بھی،لیکن اس میں کون سا معنیٰ مراد لیا جائے؟اسی طرح ایک حدیث ہے کہ: جس نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔اس کا ظاہری تقاضا ہے کہ ہر نمازی چاہے وہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا)،سب پر سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔دوسری جانب حدیث ہے: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔اب کس پر عمل کیا جائے؟

اِن جیسے موقعے پر عقلی اعتبار سے حق کو پانے کی دو ہی صورتیں ہیں: ایک

صورت تو یہ ہے کہ اِن جیسے معاملات میں اپنی عقل پر اعتماد کر کے خود سے ہی اس کا کوئی معنیٰ منتخب کرلیں اور عمل کریں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ: ہم اِن معاملات میں اپنی ناقص عقل پر اعتماد کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ اِن معاملات میں ہمارے اسلاف نے کیا معاملہ اختیار کیا ہے؟ پھر جن پر ہمارا اعتماد زیادہ ہو اور جن کا قول قرآن وسنت سے زیادہ قریب ہو ہم اُن پر اعتماد کر کے اُن کے قول پر عمل کریں۔ یہ دوسرا طریقہ اصطلاح میں ''تقلید'' کہلاتا ہے۔

لغت میں تقلید کا مطلب ہوتا ہے: کسی چیز کو اپنی گردن میں ڈالنا، اور عرف میں اس کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے معاملہ کو دوسرے کے سپرد کردے۔

شرعی اعتبار سے اس کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، سب کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ: **العمل بقول امام مجتهد من غير مطالبة دليل**. کسی امام مجتہد کے قول پر بغیر دلیل مانگے عمل کرنا۔

دراصل تقلید ان ہی لوگوں پر واجب ہے جو لوگ خود مجتہد نہیں ہیں، چنانچہ جو مجتہد نہیں ہیں بلکہ عام انسان ہیں، اُن کے اندر اس قدر علمی لیاقت وصلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ دلیل کے اندر غوروفکر کرسکیں، اسی لئے ان پر دلیل طلب کرنا اور اس میں غوروفکر کرنا واجب اور ضروری نہیں۔

لیکن.....ذرا رکئے! کیونکہ بلا دلیل کسی کی بات مان لینا اور اسے حجت ودلیل سمجھتے ہوئے عمل کرنا تو شرک ہے؟

نہیں جناب! تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مجتہد کا قول اُسے مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) یا شارع (شریعت و دین بنانے والا) سمجھ کر نہیں لیا

جاتا، بلکہ وہ تو اللہ ورسول کریم ﷺ کی تعلیمات کی تشریح کرنے والا ہے، کیونکہ جو احکام قرآن وحدیث سے قطعی طور پر ثابت ہیں ہم اُن میں کسی امام یا مجتہد کے قول پر عمل نہیں کرتے، بلکہ مجتہد کی طرف تو اس وقت رجوع کرتے ہیں جہاں کسی معاملہ میں اجمال وابہام (پوشیدگی، یعنی وہ چیز بہت زیادہ واضح نہ سمجھ آئے) یا ظاہری طور پر دو آیتوں یا دو احادیث میں ٹکراؤ اور تعارض نظر آتا ہو، اگر ہم ان کی تشریح اور مطلب بتانے پر اعتماد کرلیں تو یہ کون سا شرک ہے؟ رہی بات دلیل کی؟ تو.....ہم اُن سے دلیل کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ ہم میں وہ اجتہادی قوت جو درکار ہے ؛موجود نہیں۔ اسی لئے ہم اُن سے دلیل نہیں مانگتے۔

تقلید کی اصلیت اور اس کی روح

جو فقہاء کرام اور محدثین کتاب وسنت کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے والے ہیں، وہ قرآن وحدیث میں موجودہ مسائل کے اصول اور احکام کی روشنی میں استنباط (نئے مسائل کے حکم کو قرآن وحدیث کے ذریعہ نکالنے) کی صلاحیت رکھتے ہیں، یعنی وہ مسائل واحکام جو قرآن وحدیث میں صراحتاً (Direct) موجود نہیں ہیں، یا موجود تو ہیں مگر عام انسان اس کی گہرائی وگیرائی (Depth) تک نہیں پہونچ سکتا اور ان کے احکام کو قرآن واحادیث سے صحیح طور پر نہیں نکال سکتا وہ مقلد کہلاتا ہے، لیکن جو لوگ ایسا کرسکتے ہیں (موجودہ مسائل کی روشنی میں نئے مسئلوں کا حکم نکال سکتے ہیں) وہ مجتہد کہلاتے ہیں۔

مجتہدین حضرات کا فریضہ اور ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ: جب معاشرہ وسماج میں کوئی نیا مسئلہ پیش آئے تو وہ نصوص شرعیہ یعنی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا صحیح حکم نکالیں۔

اور جولوگ اجتہاد یعنی قرآن وحدیث سے مسائل کا حکم نہیں نکال سکتے (یعنی مقلد) ان کا وظیفہ اوران کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اُن مسائل میں جوقرآن وحدیث میں موجودنہیں ہیں؛ اِن مجتہدین علماء وفقہاء کی تقلید کریں۔

یہ تقلید شروع اسلام سے اب تک چلی آرہی ہے،اسی پر امت کا توارث (مسلسل عمل) ہے،اوائلِ اسلام یعنی پہلی دوسری صدی ہجری میں بھی جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تھا تو امت کا توارث اور عمل اسی پر رہا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنے دَور اور اپنے علاقہ کے مجتہد سے رجوع کرتے اوران سے مسئلہ کا حکم دریافت کر کے اس پر عمل کرتے تھے،اور یہی سلسلہ جَب سے اَب تک چلا آرہا ہے۔

تقلید کی قسمیں اوراس کے احکام

تقلید کی بنیادی طور پر دوقسمیں ہیں اوردونوں کے الگ الگ احکام ہیں۔ آپ دونوں قسموں کوتفصیل سے اچھی طرح سمجھیں تاکہ حق بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہ جائے۔

(1) تقلید حرام (2) تقلید واجب

تقلید حرام: اس کی کئی صورتیں ہیں،ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ دادا کی تقلید کرے اور اِس میں اللہ ورسول اللہ ﷺ کے احکام سے اِعراض کرلے یعنی اس سے منہ موڑ لے اور شریعت کی حکم عدولی (Disobey) کرے،جیسا کہ نبی ﷺ کے زمانے میں مشرکین وکفار کا حال تھا،وہ کہتے تھے:**بل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا.** (بقرہ:170) کہ ہم نے جس روش اورطریقہ پراپنے باپ دادا کو پایا ہے اسی پرچلیں گے۔ **واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ آباء نا اَولو کان الشیطن**

یدعوھم الی عذابِ السّعیر ۔لقمان(21) جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے حکم کو مانو تو وہ کہتے :نہیں! ہم تو اُن چیزوں کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔یقیناً شیطان انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف بلاتا ہے۔

قرآن کریم میں اِس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کے حکموں سے روگردانی کرتے ہوئے باپ دادا کی پیروی کرنا بڑی گمراہی،ضلالت اور شیطان مردود کا راستہ ہے۔

تقلید حرام کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جاہل اور ناواقف شخص کی تقلید و پیروی کی جائے،یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اندھا کسی اپنے ہی جیسے اندھے کے پیچھے چلے،اس کوتقلیدِ اعمیٰ کہا جاتا ہے،یہ تقلید کی مذموم اورانتہائی بُری صورت ہے اور یہ بھی حرام صورتوں میں داخل ہے۔اللہ کا فرمان ہے:**ولا تقف مالیس لک بہ علم.** جس بات کی تمہیں تحقیق نہ ہواس پرعمل مت کیا کرو۔اورایک جگہ فرمایا گیا :........**وأن تقولوا علی اللہ مالا تعلمون** ۔اللہ نے اس بات کوحرام کردیا ہے کہ تم اللہ کے تعلق سے ایسی باتیں کہوجس کا تمہیں علم نہیں ہے۔تو جوشخص نہ جاننے کے باوجود اللہ اور شریعت کی طرف سے کوئی حکم بیان کرے گا وہ حرام کام میں مبتلا اور گمراہ ہے اور جواس کوصحیح سمجھ کراس پرعمل کرے گا وہ بھی گمراہ ہے۔اب اسی سے اندازہ لگائیں کہ جولوگ شریعت کونہیں جانتے،اسلامی تعلیمات کے مزاج سے واقف نہیں ہیں،پھربھی اسٹیجوں پر کھڑے ہوکرقرآن وسنت کا دِل چاہا حکم بتا رہے ہیں،اُن کا کیا انجام ہوگا؟اس لئے جوشخص اسلام کے احکام سے واقف نہیں ،اسلامی تعلیمات کے تقاضوں پرعمل نہیں کرتا،اس کے لئے شریعت کا حکم بتانا حرام ہے،اورایسے لوگوں کی تقلید وپیروی کرنا بھی حرام۔

تقلید حرام کی تیسری صورت یہ ہے کہ جس کی تقلید کی جارہی ہے،اس کی غلطی ظاہر ہوجائے اور یہ بات ثابت ہوجائے کہ وہ غلطی پر ہیں،لیکن پھر بھی اس غلط بات پر جمے رہنا،جیسے کوئی شخص کسی امام کوغلطیوں سے معصوم سمجھ لےاوران کی لغزش ثابت ہونے کے بعد بھی اسی پر جمارہے۔یہ تقلید بھی حرام ہے۔

اگر کسی امام ومحدث یا فقیہ سے کسی مسئلہ میں غلطی ہوجائے تو اس کی پیروی نہیں کرنی چاہئے،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے استنباط کئے ہوئے تمام مسائل کوچھوڑ دیا جائے،ان کی بات کوکسی بھی معاملہ میں صحیح نہ سمجھا جائے۔بلکہ جس مسئلہ میں ان کی خطاءاور غلطی ظاہر ہوئی ہے،اس مسئلہ میں ان کی تقلید وپیروی کرنا ناجائز ہے،باقی مسائل میں ان کی پیروی کی جائے گی۔کیونکہ اللہ رب العزت اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی گمراہی کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:**اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ** . (توبہ:31)انھوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں (پادریوں)اورعلماءکواپنارب بنالیا۔اوردوسری جگہ ارشاد ہے:**اتبعوا ما أُنزل الیکم من ربکم ولاتتبعوا من دونہ اولیاء**. (اعراف:3)جواللہ نے نازل کیاہےاس کی پیروی کرو،اوراس کوچھوڑ کر اولیاءکی پیروی نہ کرو۔اس آیت میں "**من دونہ**" (اس کوچھوڑکر) کالفظ صاف صاف بتارہاہے کہ جہاں اللہ ورسول کاحکم موجود ہواس میں اُن کے احکام کوچھوڑ کر کسی دوسرے کی پیروی واتباع اور تقلید کرنا حرام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص (چاہے وہ کتنا ہی بڑا محدث وفقیہ اور عالم کیوں نہ ہو) قرآن وحدیث کے خلاف اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی مزاج کے خلاف کوئی بات کہے گا تو اس کی بات ہرگز نہیں مانی جائے گی، بلکہ اُسے علماءحق کے گروہ سے بھی خارج کردیا جائے گا۔کیونکہ رسول کریم ﷺ نے تنبیہی انداز میں

فرمایا ہے: جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کہی اُسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

تقلید کی دوسری قسم ہے تقلیدِ واجب:

یہ تقلید دین کے فروعی اوراجتہادی مسائل میں ہوتی ہے،یعنی نئے پیش آنے والے وہ مسائل جن کا حکم قرآن وحدیث سے ہر شخص نہیں نکال سکتا، بلکہ علماءِ مجتہدین اور علماء ربانیین قرآن وحدیث میں بیان کئے ہوئے اصول واحکام کو مدِ نظر (سامنے) رکھ کر اپنی خداداد صلاحیت ومہارت سے اس کا حکم نکالتے ہیں،اور عوام یعنی وہ لوگ جو خود سے اجتہاد کر کے مسائل نہیں نکال سکتے،ان کے لئے اِن اجتہادی مسائل میں علماء و مجتہدین کی تقلید و پیروی (Follow) کرنا ضروری ہے۔اسی طرح اِن مسائل میں اُن لوگوں پر بھی مجتہدین کی تقلید کرنا واجب ہے جو عالم تو ضرور ہیں، مگر اُن میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اَز خود قرآن وحدیث سے صحیح طریقہ پر کسی نئے مسئلہ کا حکم معلوم کرسکیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح نظریہ قائم کرسکیں۔

اہلِ حق کا یہی مسلک ہے،اسی کو پیشِ نظر رکھ کر آگے بڑھیں اور ایک بار پھر سے ملاحظہ کریں کہ: فروعی مسائل میں ہر اس شخص پر مجتہدین کی تقلید کرنی ضروری ہے جو خود اجتہاد نہ کرسکتے ہوں۔اگر آپ نے اِس نکتہ کو سمجھ لیا تو گویا آپ نے تقلید کے تعلق سے ساری باتیں سمجھ لی۔

ذرا دیکھئے تو سہی! حضرت علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ اپنی کتاب "**جامع بیان العلم و فضلہ**" (2/114) میں فرماتے ہیں کہ: عام لوگوں کے لئے وقت اور حالات کے تحت نئے پیش آنے والے مسائل میں علماء کرام کی تقلید کرنا نہایت ضروری ہے،اس لئے کہ وہ لوگ خود سے مسئلہ کا حکم معلوم نہیں کرسکتے ،نہ ہی

ان کی سمجھ اتنی دور تک پہونچ سکتی ہے۔اور اِس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ عام شخص (عام سے وہ لوگ مراد ہیں جو اجتہاد نہیں کر سکتے ہیں) پر اِن (یعنی وہ مسائل جو صراحۃً قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہیں) مسائل میں علماء کی تقلید کرنا واجب ہے۔اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: **فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون.** النحل (43) اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہلِ علم سے پوچھو۔

جس طرح سب لوگ اِس بات پر متفق ہیں کہ نابینا اور اندھے شخص کے لئے دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے پیچھے پیچھے چلنا ضروری ہے، اسی طرح جس شخص کے پاس علم نہیں ہے، یا علم تو ہے مگر اِتنا علم نہیں کہ وہ خود سے مسائل کے احکام جان سکے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اُن لوگوں کی پیروی کرے جو اِن سب اُمور کے ماہر ہیں۔

علامہ ابن قدامہؒ "روضة الناظر" (383) میں لکھتے ہیں: فروعی مسائل (جو مسائل اعتقاد سے تعلق نہیں رکھتے ہیں اور وہ مسائل جو قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہیں بلکہ اِن کی روشنی میں اُس کا حکم نکالا جا سکتا ہے) میں تقلید کرنا جائز ہے اور عام شخص کے لئے اِن مسائل میں تقلید کرنا واجب ہے۔

علامہ آمدیؒ "اِحکام" (4/234) میں فرماتے ہیں کہ: عامی اور وہ شخص جس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت نہ ہو، چاہے وہ اجتہاد کے علوم میں ماہر ہو، (یعنی اجتہاد کے طریقے اور اس کے اصول میں ماہر ہو مگر خود اجتہاد کی قوت نہ رکھتا ہو) اُس پر ضروری ہے کہ وہ مجتہدین کے فتاویٰ پر عمل کرے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "منهاج السنة النبويه" (2/142) میں لکھتے ہیں کہ: وہ شخص جو استدلال سے عاجز ہے، اس کے لئے عالم کی تقلید کرنا جمہورِ علماء مسلمین کے نزدیک ضروری ہے۔

الغرض تمام علماء اسلام کا اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ: جو شخص درجۂ اجتہاد کو نہ پہونچا ہو (یعنی خود سے پیش آمدہ مسائل کا حکم قرآن و حدیث سے اخذ نہ کر سکتا ہو) اس کے لئے ایسے مسائل میں علماء کرام اور اہلِ علم حضرات کی تقلید کرنا اور ان کی پیروی کرنا واجب ہے۔اور وہ مسائل جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں، ان مسائل میں بھی عامی شخص کا وظیفہ (کام) یہی ہے کہ وہ علماء حضرات سے پوچھ کر عمل کریں۔

دلائل

وہ تقلید جو میں نے اوپر بیان کی (یعنی عام شخص کا فروعی مسئلوں میں علماء کی تقلید کرنا) واجب ہے، تمام اہلِ اسلام کا اس پر مکمل اتفاق ہے، اس کے واجب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون.** (نحل:43) اگر تم نہیں جانتے ہو تو علم والوں سے پوچھو۔اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ جس شخص کو کوئی بات معلوم نہ ہو، وہ اپنے سے زیادہ علم والے سے پوچھے، اور پوچھنے کا منشاء سوال کرنا یا علم حاصل کرنا نہیں، بلکہ پوچھ کر اس کو ماننے اور اس پر عمل کرے۔اس سے ثابت ہوا کہ: جو شخص اجتہاد نہ کر سکتا ہو (یعنی خود سے پیش آمدہ مسائل کا حکم قرآن و حدیث سے اخذ نہ کر سکتا ہو) اس کے لئے علماء کرام اور اہلِ علم حضرات کی تقلید کرنا اور ان کی پیروی کرنا واجب ہے۔

اللہ کا فرمان ہے: **يٰٓاَيُّها الّذِينَ آمَنُوا اَطِيعُوا الله و اَطِيعُوا الرَسُولَ وَ اُولِي الامرِ مِنكُم.** نساء (59) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی۔اس آیت کے تحت صاحب "درمنثور"

نے حضرت ابن ابی شیبہؒ، حضرت ترمذیؒ، ابن جریرؒ، ابن ابی منذرؒ اور حضرت حاکمؒ کی تصحیح کے حوالہ سے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے نقل کیا ہے: اولوالامر سے مراد ''اہلِ فقہ (فقہاء) اور اہلِ خیر ہیں۔

اس آیت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ: اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی بات کو سمجھنے کے لئے یا اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آ گیا جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں ظاہراً موجود نہیں ہے تو اس کے حکم کے سلسلہ میں علماء وفقہاء کی ہی بات مانی جائے گی۔ اور تقلید نام ہی ہے اس کا کہ: جو احکام قرآن وسنت میں ظاہری اعتبار سے موجود نہیں ہیں، ان کے احکام کے لئے علماء سے رجوع کر کے پوچھنا اور اس پر عمل کرنا۔

اللہ عزوجل نے فرمایا: **فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون.** (توبہ:122) کیوں نہ ہوا کہ ان میں کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلیں کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈرائیں اس امید پر کہ وہ لوگ بچیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں کہ ہر شخص پر مجتہد بننا ضروری نہیں، بلکہ بعض لوگ اس فریضہ میں مشغول رہیں اور دوسروں کو بتائیں، چنانچہ وہ لوگ جو دین کی پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل نہیں کریں گے، ان پر عالم حضرات کی تقلید کرنا ضروری ہوگا۔

قرآن کریم کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن سے صاف اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ''عام شخص پر علماء وفقہاء کے بیان کردہ احکام کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے''۔

آیئے اب ذرا حدیثِ رسول سے پوچھیں کہ: عام شخص پر علماء کی تقلید کرنے کا

کیا حکم ہے؟

اگر کسی شخص کی رکعت فوت ہو جاتی تو وہ نماز میں امام کے ساتھ ملنے سے پہلے اپنی چھوٹی ہوئی رکعات پوری کرتا پھر امام کے ساتھ شریک ہوتا، حضرت معاذؓ کی بھی ایک دن رکعت چھوٹ گئی تو وہ نماز میں شریک ہوئے اور جب نبی ﷺ نے سلام پھیر دیا تو انھوں نے کھڑے ہو کر نماز پوری کی، پس نبی ﷺ نے فرمایا: معاذؓ نے ایک اچھا طریقہ اپنایا ہے، تم بھی اس کی پیروی کرو۔ (ابوداؤد:506)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام کو حضرت معاذ رضی اللہ کی پیروی کرنے کا حکم فرمایا جس سے تقلید کا حق ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ جناب نبی ﷺ کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے پتہ نہیں میں تمہارے درمیان کب تک رہوں گا؟ میرے بعد والوں کی پیروی کرنا۔ (یہ کہتے ہوئے آپؐ نے حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ کی جانب اشارہ فرمایا) اور عمارؓ کے راستہ پر چلنا اور ابن مسعودؓ جو بھی تم سے بیان کریں اس کو سچ جاننا۔ (ترمذی:3799)

اس حدیث میں نبی ﷺ نے لوگوں کو صحابۂ کرام کی تقلید کا حکم فرمایا اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی تلقین فرمائی، جس سے پتہ چلا کہ: نبی ﷺ کے بعد اہلِ علم حضرات کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری میں ایک واقعہ آتا ہے کہ دو شخص نبی ﷺ کے پاس اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ: میرا بیٹا اِس شخص کے یہاں مزدور تھا اور اُس (میرے بیٹے) نے اِس کی بیوی سے زنا کر لیا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو رجم کر دیا جائے گا تو میں نے اِسے فدیہ میں سو بکریاں اور اپنی ایک باندی دے دی، پھر میں نے اہل علم سے اس مسئلہ کے بابت دریافت کیا

تو معلوم ہوا کہ میرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور رجم تو اس کی بیوی کو کیا جائے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کرتا ہوں کہ: تم پر تمہاری بکریاں اور باندی لوٹا دی جائے۔ پھر رسول کریم ﷺ نے اس کے بیٹے کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے اسے جلاوطن کیا، پھر حضرت انیس اسلمیؓ کو حکم فرمایا کہ: اگر اس کی بیوی زنا کا اعتراف کر لے تو اسے رجم کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس حدیث میں دیکھیں کہ اس شخص کے والد نے کہا: ''میں نے اہل علم سے اس مسئلہ کا حکم معلوم کیا تھا'' اس سے ثابت ہوا کہ جناب نبی ﷺ کے زمانے میں بھی عام صحابۂ کرام اپنے میں کے اہلِ علم صحابۂ کرام سے مسئلہ کا حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرتے تھے اور نبی ﷺ نے اس سے منع بھی نہیں فرمایا جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ عوام حضرات کے لئے علماء سے مسائل کا حل پوچھ کر اس پر عمل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری اور واجب ہے۔

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے ملعون لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی ان پر مار ہو، وہ جب جانتے نہیں تھے تو پوچھتے بھی نہیں تھے۔ (ابوداؤد: 337)

اس حدیث میں نبی ﷺ نے رہنمائی فرمائی کہ جو لوگ جانتے نہیں ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ لوگ عالم و مجتہد حضرات سے پوچھ کر عمل کریں۔

عقل سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شخص کے لئے اجتہاد کرنا ضروری نہیں، کیونکہ اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو نبی کریم ﷺ کے عہد میں آنجناب ﷺ تمام صحابۂ کرام کو حکم فرماتے کہ وہ آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے رہیں اور بلا واسطہ قرآن و حدیث کا علم سیکھیں، جب کہ اس کے برعکس معاملہ یہ تھا کہ بعضے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کاروبار میں لگے رہتے اور بعضے صحابہ آپ کی مجلس میں موجود رہتے، پس جو

صحابۂ کرام آپ کی مجلس میں نہ ہوتے، وہ آپ ﷺ کی مجلس میں موجود رہنے والے حضرات سے مسائل دریافت کر کے عمل کرتے تھے۔

پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی مصلحت کے لئے اور نظامِ عالم کو چلانے کے لئے کھیتی باڑی، کاروبار اور بہت سارے کاموں کا سلسلہ جاری فرمایا، چنانچہ اگر تمام لوگوں کو اجتہاد اور تحقیق ہی کا حکم دے دیا جائے اور عوام پر علماء کی تقلید حرام کر دی جائے تو اس سے دنیا کے نظام میں بڑا فساد اور بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔ پھر کھیتی باڑی اور کاروبار میں لگنے والے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

پس ان تمام دلائل سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ: عام شخص پر علماء حق کی پیروی اور تقلید کرنا بالکل ضروری اور واجب ہے۔

مجتہد سے مسئلہ کا حکم معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟

سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ کسی بھی مسئلہ میں کوئی شخص کسی عالم و فقیہ سے اس کی ذاتی رائے نہیں پوچھتا، بلکہ وہ اللہ و رسول اللہ ﷺ کی مراد اور ان کا منشاء معلوم کرنا چاہتا ہے، عوام کو علماء کی تقلید کا حکم اس لئے دیا گیا کہ: علماء حضرات اللہ و رسول اللہ ﷺ کی مراد اور ان کے منشاء کو بہتر اور صحیح طریقہ پر سمجھ سکتے ہیں۔

پھر بات مسلم ہے کہ صرف کتابوں سے کام نہیں چل سکتا بلکہ کتاب کو صحیح سمجھنے کے لئے رجال (اللہ والے) کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً آج ہزاروں قسم کی انجیئرنگ، ڈاکٹری اور اس طرح کی Higher educations وغیرہ کی کتابیں موجود ہیں، مگر پھر بھی لوگ اسکول و کالج میں داخل ہو رہے ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم لاکھوں روپئے خرچ کر کے اس طرح کے مہنگے اسکول و کالج میں داخلہ لیں؟ اور وہاں کے تجربہ کار اساتذہ کی صلاحیت و مہارت سے فائدہ اٹھائیں؟

اگر کوئی شخص ڈاکٹری کی کتابیں اور سرجری کے طریقے پڑھ لے، پھر ایک اسپتال کھول کر بیٹھ جائے اور آپریشن بھی شروع کر دے تو اُسے ڈاکٹر نہیں بلکہ مجرم کہا جاتا ہے، اور جو شخص ایسے نام نہاد ڈاکٹر سے علاج کرائے اُسے نادان اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

تو بھلا کوئی شخص دین کی چند کتابیں پڑھ لے، قرآن وحدیث کے ترجمے دیکھ کر اپنے آپ کو قرآن وحدیث کا ماہر سمجھنے لگے اور پھر ائمۂ ہدیٰ اور اسلاف کے ساتھ بدگمانی کرتے ہوئے اُن کی شان میں گستاخی کرے اور نااہل (جو اجتہاد نہ کرسکتا ہو) کے لئے اُن کی تقلید و پیروی کو شرک و بدعت کہے، بس یہی نہیں، بلکہ اپنی ناقص عقل اور کم علمی پر اعتماد کرتے ہوئے خواہشات کی پیروی کو عین توحید و اسلام سمجھے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ بریں عقل و دانش بباید گریست! افسوس صد افسوس!

ظاہر ہے دنیا میں کوئی بھی شخص دوسرے کی پیروی اور تقلید کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا، اِسے اِس طرح کہہ لیں کہ: تقلید کے بغیر زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی، ہر ہنر اور ہر علم میں اُس کے ماہرین کی پیروی کرنی ضروری ہے، لوہار، سنار، تاجر و کسان سب اپنے اپنے ماہرین کی پیروی کرتے ہیں، اور جب دین کا معاملہ دنیا کے معاملہ سے زیادہ اہم اور مشکل ہے، تو کیا اِس میں تقلید کے بغیر کامیابی ہوسکتی ہے؟

تقلید (دوسرے کو دیکھ کر یا اس کی بات سن کر بغیر دلیل مانگے عمل کر لینا) ایک فطری چیز ہے جو انسان کے ساتھ سایہ کی طرح لگی ہوئی ہے، ہمارے چھوٹے بچے گھر کے بڑوں کو دیکھ کر ہی نماز پڑھتے ہیں، گھر کی عورتیں عموماً عالمہ و فاضلہ نہیں ہوتی، وہ مَردوں سے پوچھ کر ہی عمل کرتی ہیں، اس پوچھ کر عمل کرنے کو کیا شرک و بدعت کہا جائے گا؟

تقلید شرعی کی ابتداء

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرات صحابہؓ دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے، اُن میں بہت سے صحابی اپنے اپنے علاقہ کے امام اور مقتدیٰ تھے، جب مسلمانوں کے درمیان کوئی مسئلہ پیش آتا تو لوگ اپنے علاقہ کے صحابی سے اس کا حکم معلوم کرتے تھے، چنانچہ تاریخ کے اوراق پلٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ: مکہ کے مسلمان حضرت ابن عباسؓ کے مقلد تھے، مدینہ والے حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید کیا کرتے تھے، کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی تقلید ہوتی تھی اور یمن میں حضرت معاذؓ بن جبل امام و مقتدیٰ تھے۔

غور کریں! صحابۂ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز (زیادہ) تھی، مگر اُن میں بڑے بڑے اور مجتہد صحابہ صرف سینکڑوں میں منحصر تھے، پس جو صحابہ مجتہد نہیں تھے وہ مجتہد کی تقلید کیا کرتے تھے۔

جب صحابہ کا دور ختم ہوا تو مکہ والے حضرت عطاءؒ کی تقلید، مدینہ کے مسلمان حضرت نافعؒ کی، کوفہ والے حضرت ابراہیم نخعیؒ کی اور یمنی حضرات حضرت طاؤسؒ کی تقلید کرنے لگے۔

صحابۂ کرام کے زمانے سے چاروں مسلک کے وجود میں آنے تک......لوگ اسی طریقہ کو اپناتے رہے کہ انھیں جو مجتہد مل جاتا ان کی تحقیق پر عمل کر لیتے، اِس عمل پر تمام مسلمانوں کا عملی اتفاق رہا اور کبھی کسی نے اِس پر انگلی بھی نہیں اٹھائی، یعنی تقلید کے واجب ہونے پر اجماع ہوگیا۔

ذرا رکئے تو سہی! نبی ﷺ نے فرمایا: میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی (مسند احمد:6/78) اور پوری امت اس بات پر متفق ہوگئی کہ تقلید کرنا

نہایت ضروری ہے، چنانچہ تقلید گمراہی نہیں ہوئی، کیونکہ نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق امت گمراہی پر جمع ہو ہی نہیں سکتی، پس اس کا خلاف یعنی تقلید کو غیر ضروری سمجھنا اور اسے حرام کہنا گمراہی ہوگا۔

کسی اور موقعہ پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: سوادِ اعظم (یعنی جس بات پر مسلمانوں کی اکثریت متفق ہے) کی اتباع کرو، اس لئے کہ جو اِن سے ہٹ کر دوسرا راستہ چُنے گا، وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ مستدرک حاکم (394) اب دیکھیں کہ سوادِ اعظم یعنی امت کا بڑا طبقہ اس تقلید کے حق اور واجب ہونے پر متفق ہے، اور حدیث کہہ رہی ہے کہ سوادِ اعظم کی پیروی کرو، لہٰذا اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے تقلید کو واجب ماننا ہوگا، ورنہ جو اِس راہ سے ہٹے گا اور تقلیدِ واجب کو غلط اور حرام کہے گا، وہ آگے والے جملہ میں شامل ہوجائے گا کہ: جس نے اِس کے علاوہ دوسری راہ اختیار کی، وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تقلید شخصی کی حقیقت، اس کا رواج اور اس کی ضرورت

تقلید شخصی کا مطلب ہوتا ہے کسی ایک متعین شخص کی تقلید کرنا، ہر مسئلہ میں انھیں کی پیروی کرنا۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

(1) ایک تو یہ کہ کسی امام و مجتہد کو متعین نہ کیا جائے، بلکہ کبھی ایک امام کے مسلک پر اور کبھی دوسرے کے مسلک پر عمل کرلیا جائے، اِسے تقلیدِ مطلق کہتے ہیں۔ صحابۂ کرام سے لے کر مذاہبِ اربعہ کے ظاہر ہونے تک مسلمانوں کا عام رواج اور دُستور یہی رہا کہ کوئی عالم اور مجتہد مل جاتا تو اس کی تقلید کرلیتے، اور کبھی بھی کسی معتبر شخصیت نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ نبی ﷺ کے بعد عام صحابۂ کرام (جو مجتہد نہ تھے) کا عمل بھی یہی تھا کہ مکہ والے حضرت ابن عباسؓ کی، مدینہ والے حضرت زید بن ثابتؓ کی اور اہلِ کوفہ حبر العلم حضرت ابن مسعودؓ کی تقلید کرتے

تھے۔ اس تقلید کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں، حدیث کی بہت سی کتابیں اس طرح کے مسائل سے بھری پُری ہیں، مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرتؒ نے صحابۂ کرام اور تابعین کے فتاوے نقل کئے ہیں جو سب کی سب تقلید ہی ہے۔

(2) تقلیدِ شخصی کی دوسری صورت یہ ہے کہ: تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد یا امام کو متعین کرلیا جائے اور ہر مسئلہ میں انھیں کی پیروی کی جائے۔ اسلاف میں اس تقلید کا ثبوت بھی بہت سی جگہ موجود ہے۔

جب حضرت رسول کریم ﷺ سیدنا معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیج رہے تھے تو اُن سے دریافت کیا: کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کی کتاب سے۔ نبی ﷺ نے پوچھا: اگر وہ حکم اللہ کی کتاب میں موجود نہ ہو تو؟ انھوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کی سنتوں سے۔ پھر نبی ﷺ نے تیسری بار پوچھا: اگر میری سنتوں میں بھی وہ حکم نہ ملے تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے برجستہ کہا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ پس نبی ﷺ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: تمام تعریف وشکر اُس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے پیغمبر محمد ﷺ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اُس کا رسول خوش ہے۔ ابوداوٗد (3594)

اِس اِجتہاد کی اجازت دینے کا مقصد اِس کے سوا اور کیا تھا کہ نبی ﷺ نے (اُن احکام میں جو قرآن وحدیث میں نہیں ہیں) یمن والوں کو حضرت معاذ کی تقلیدِ شخصی کرنے کا حکم فرمایا اور یمن والوں کے لئے سیدنا معاذؓ کی تقلید کو لازم کردیا۔

صحیح بخاری (1757) میں حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے کہ: اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اُس عورت کے بارے میں پوچھا جو طواف فرض کرنے کے بعد حائضہ ہوگئی تو کیا وہ طوافِ وداع کئے بغیر واپس جاسکتی ہے؟ انھوںؓ نے جواب مرحمت کیا: جاسکتی ہے۔ اہلِ مدینہ نے کہا: ہم آپ کی بات پر عمل کر کے حضرت زید بن ثابتؓ کے فتویٰ کو نہیں چھوڑ سکتے۔

یعنی اہلِ مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلیدِ شخصی کرتے تھے،اس لئے اُنھوں نے کہا کہ: ہم آپ کی بات پر عمل کر کے حضرت زید بن ثابتؓ کے فتویٰ کو نہیں چھوڑ سکتے۔اوراس پر حضرت ابن عباسؓ جیسے علم والے صحابی نے نکیر بھی نہیں کی،اگر یہ تقلید حرام ہوتی تو ابن عباسؓ جیسے علم کے پہاڑ اور ہمت والے صحابی فوراً کہہ دیتے کہ: تم لوگ ایک شخص کی تقلید کر کے حرام کے مرتکب ہورہے ہو۔لیکن حضرت ابنِ عباسؓ نے اس پر نکیر نہ کی،جس سے ثابت ہوا کہ: ہر ہر مسئلہ کے لئے صرف ایک ہی مجتہد کو متعین کر لینا اور ہر جزئیات میں صرف اسی کی پیروی کرنا جائز ہے۔

پہلی قسم کی تقلید (یعنی جب جس کے مسلک پر چاہا عمل کرلیا) فی نفسہ یعنی اصل کے اعتبار سے جائز ہے،لیکن اِس زمانہ میں تقلید کی یہ صورت حرام لغیرہ یعنی مختلف اسباب وعلل (Causes) کی وجہ سے حرام ہے۔اور دوسری قسم (یعنی صرف ایک امام ومجتہد کو متعین کر کے ہر مسئلہ میں ان ہی کی تقلید وپیروی کرنا واجب ہے)

پہلی قسم کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں دین پر چلنا غالب تھا،لوگوں کا منشاء احتیاط پر عمل کرنا ہوتا تھا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ: حائضہ عورت بغیر طواف کے جاسکتی ہے تو مدینہ والوں نے حضرت عباسؓ کے قول کو چھوڑ دیا اور حضرت زیدؓ کے فتویٰ پر عمل کیا کہ: بغیر طواف کئے نہیں جاسکتی۔کیونکہ انھیں لگا کہ احتیاط یہ ہے کہ طواف کرلیا جائے تاکہ حج میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

لیکن ....رفتہ رفتہ جب لوگوں میں نفسانی خواہشات کی پیروی کا غلبہ ہونے لگا،لوگوں کی دینی حالت بد سے بدتر ہونے لگی،لوگ اِس روِش پر چلنے لگے کہ جس کا قول اپنی غرض اور مطلب کے موافق ہوتا اس پر عمل کرتے تو غرض پرستی اور سہولت پسندی کی وجہ سے چوتھی صدی ہجری میں پوری دنیا کے علماء کا اس بات پر اتفاق

ہو گیا کہ: اِن چار مذاہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی پیروی کرنا جائز نہیں،اور یہ بھی جائز نہیں کہ مختلف مسئلوں میں مختلف اماموں کی تقلید کی جائے۔یعنی: تقلیدِ شخصی فی نفسہ واجب یا فرض نہیں، بلکہ یہ واجب لغیرہ یعنی کچھ علتوں اور اسباب کی بناء پر واجب ہے۔

تقلید شخصی میں شخص کا مطلب حقیقی شخص (Real person) نہیں ہوتا، بلکہ شخص حکمی یعنی (Legal person) مراد ہوتا ہے،اس کا مطلب کسی خاص مکتبِ فکر (School of thought) کی تقلید کرنا ہوتی ہے، ہر ہر مسئلہ میں کسی خاص شخص کی تقلید نہیں کی جاتی، مذاہبِ اربعہ سے واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ کسی بھی مکتبِ فکر میں کسی ایک ہی امام کے سارے اقوال مفتیٰ بہ نہیں ہوتے (اُن کے ہر قول پر عمل نہیں کیا جاتا)، چونکہ زمانے کی رفتار رُکنے والی نہیں اور ائمۂ مجتہدین دنیا سے گذر چکے ہیں،اس لئے نئے زمانہ میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کا فتویٰ موجودہ مفتیان ہی دیں گے اور وہ رائے جس مکتبِ فکر کے اصول پر مبنی ہوگی وہ اسی دبستانِ فکر میں شمار ہوگی۔

چار ہی امام کیوں؟

جب شروع زمانہ میں بہت سے مجتہدین تھے اور لوگ جس کی چاہتے تقلید کر لیتے تھے تو پھر آگے چل کر یہ چار ہی امام کیوں باقی رہے، پانچ یا چھ کیوں نہیں ؟اور کیا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ان چاروں ائمہ سے ہٹ کر اسی زمانے کے کسی مجتہد(مثلاً امام اوزاعیؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت عطاءؒ) کی تقلید کرے تو کیا اس کی گنجائش ہے؟

چار ہی امام کیوں؟ پانچ کیوں نہیں؟ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ اگر پانچ ہوتے تب بھی آپ سوال کرتے کہ پانچ ہی کیوں؟ چھ کیوں نہیں؟ چھ ہوتے تو چھ ہی کیوں؟ سات کیوں نہیں؟ چار ہی کے ہونے کی مصلحت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا اور سمجھتا ہے۔

لیکن ظاہری اسباب و حالات کے تناظر میں......ذرا تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے جانیں کہ شروع دور میں گرچہ بہت سے مجتہدین گذرے ہیں، لیکن اللہ رب العزت نے اِن چاروں ائمہ(حضرت امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل رحمہم اللہ) کو ایک خاص اہمیت سے نوازا جس کی وجہ سے اِن کے اجتہادات و تحقیقات کی روشنی دنیا بھر میں پھیل گئی اور بقیہ مجتہدین کے اجتہادات ان کی تیز روشنی میں گُم ہو کر رہ گئیں، اس کے بہت سے اسباب (Reasons) تھے۔ مثلاً:

شاگرد:(Students) اللہ رب العزت نے اِن چاروں اماموں کے اتنے زیادہ اور ذہین و فہیم(Intelligent) شاگرد تیار فرمائے جو پوری دنیا میں پھیل گئے اور انھوں نے اپنے علم و فضل کی وجہ سے وہ مقام پیدا کر لیا کہ لوگ اِن

حضرات کی تحقیقات کو دوسرے مجتہدین کی تحقیقات پر ترجیح (Preference) دینے لگے۔

معاملۂ قضاء:(Judgment) پہلے زمانے میں نئے پیش آنے والے مسائل کا حل قاضی مسلمین نکالا کرتے تھے، یعنی تمام لوگوں پر قاضی (Judge) کے فیصلہ کو ماننا لازم ہوتا تھا اور قاضی کا حکم ہی ان کا مسلک قرار پاتا تھا، اِدھر حکومت ایسے افراد کو قاضی بناتی تھی جو علم و فضل اور مقام و مرتبہ میں انتہائی اعلیٰ(High Level کے) ہوں، چنانچہ اِن اوصاف کے اکثر اہلِ علم حضرات اِن ہی چاروں اماموں کے شاگردان تھے، لہٰذا یہ منصبِ قضاء پر فائز ہوتے رہے اور اِن کے فتویٰ و احکام کی وجہ سے لوگوں کا مسلک بھی اِن کے مسلک کے مطابق ہوتا چلا گیا۔

تدوینِ مذاہب: مجتہدین تو بہت سے گذرے جن کی تعداد سینکڑوں تک جا پہونچتی ہے، مگر ان سب کے مسلک کی الگ الگ باقاعدہ اس انداز سے تدوین نہیں ہو سکی اور ان کے مذہب کے اصول منقح نہیں ہو سکے کہ: اُن کی تقلید کرنے والا دوسروں سے بے نیاز ہو جائے، یہ فخر و امتیاز اللہ پاک نے حضرات ائمہ اربعہ کو عطاء فرمایا کہ: ان میں سے ہر ایک کے مذہب کی جزئیات اور اصول اِس انداز میں مدون ہوئے کہ جو شخص دین کے جس بھی مسئلہ میں رہنمائی (Guidance) چاہے، اس کو ہر مذہب میں رہنمائی مل سکتی ہے۔

پھر چوتھی صدی ہجری میں تحقیق (Research) کرنے سے سوادِ اعظم (امت کی اکثریت) کا اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ جامعیت اور تدوین کے اعتبار سے حضرات ائمۂ اربعہ کے مسالک سے زیادہ کوئی بھی مسلک جامع اور مکمل نہیں ہے، اس لئے اُس وقت علماءِ امت کا اجماع ہو گیا کہ ائمۂ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید نہیں کی جائے گی۔

اور.......جب کہ اِس زمانہ میں لوگوں کے اندر پہلی سی صلاحیت،تقویٰ،اللہ کا خوف اور سمجھ بوجھ نہیں ہے،اکثر لوگ نفسانی خواہشات کے غلام ہو چکے ہیں،یہ دور اپنی رائے کو اچھا سمجھنے کا دور ہے،اِن تمام امور کی وجہ سے مصلحت اور حالات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اِن ائمہٗ دین کے علاوہ کسی اور کی تقلید نہ کی جائے۔تا کہ دین سے دور ہو جانے اور دین کو کھلونہ بنا لینے کی نوبت نہ آ جائے۔

اللہ نہ کرے! آپ ایسا نہ سمجھیں کہ اِن چاروں اماموں کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے مذہبوں میں کوئی نقصان یا کوئی کمی تھی بلکہ اُن حضرات کے مذاہب کو چھوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذاہب با قاعدہ طور پر مرتب نہ ہو سکے،ان کے مذہب پر عمل کرنے کے شرائط و قیود سے ہم بے خبر ہیں اور وہ مذاہب ہم تک تواتر و تسلسل کے ساتھ نہیں پہونچے،اگر وہ ہم تک تواتر کے ساتھ پہونچتے تو بلا شبہ اس پر بھی عمل کرنا جائز ہوتا۔

پھر یہ بات بھی ذہن نشیں کرلیں کہ جب اِن چاروں مذاہب کے علاوہ اور بقیہ مذاہب معدوم اور ختم ہو چکے ہیں،تو اب اِنھیں چاروں کا اتباع سوادِ اعظم (بڑے طبقہ) کا اتباع کہلائے گا،اور اسی کا حدیث میں حکم ہے،اور اِن چاروں سے نکل کر دوسری راہ اختیار کرنا سوادِاعظم سے نکلنا کہلائے گا اور ایسے شخص کے بارے میں نبیﷺ نے فرمایا: جو اِن سے الگ ہوا،وہ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

چاروں امام حق پر کیسے ہیں؟

چاروں امام حق پر کیسے ہیں؟ جب کہ حق تو صرف ایک ہوتا ہے؟اس لئے اگر حق کو پانا ہے تو سب کی تقلید کا قلادہ گردن سے اتاریں اور قرآن وحدیث پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کریں۔

یہ شبہ کم علمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے،کسی بھی عالم یا امام یا محدث وفقیہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ: چاروں امام حق پر نہیں ہیں،سچی بات یہ ہے کہ چاروں حق پر ہیں،اس کی وجہ یہ ہے کہ چاروں مسلکوں کا مأخذ ومرجع (End point) ایک ہی ہے،جیسے کعبہ ایک ہے،اس کی چار سمتیں ہیں،ہر سمت والے اپنے اپنے حساب سے اس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور سب کی نماز ادا ہو جاتی ہے۔اسی طرح سب کی اصل اور جڑ ایک ہی قرآن وحدیث ہے،اور ہر ایک مذہب والے اسی قرآن وحدیث سے مسئلہ کا حکم نکالتے ہیں،لیکن اِن سب کے مسائل میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ:کبھی کوئی امام کسی حدیث یا آیت کا معنی اپنے پاس موجودہ قرائن وشواہد کی وجہ سے متعین کر کے اس پر عمل کرتے ہیں،اور دوسرے امام کے یہاں وہی چیز دوسری وجوہات کی بناء پر درست نہیں ہوتی۔کبھی ایک امام حدیث کے ظاہر الفاظ پر عمل کر لیتا ہے اور دوسرا امام اس حدیث کے علاوہ دوسری حدیثوں کو بھی سامنے رکھ کر قرآن وحدیث کی مُراد تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے،جس کی وجہ سے دونوں کے یہاں احکام الگ ہو جاتے ہیں۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بنو قریظہ کے واقعہ میں نبیﷺ نے صحابہٗ کرام سے فرمایا: **لا یصلین احدُکم اِلا فی بنی قُریظَة.** کہ تم میں سے کوئی بھی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ کے علاوہ کہیں اور نہ پڑھے۔راستہ میں نماز کا وقت آ گیا،کچھ صحابہ

چلتے بنے اور حدیث کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا کہ بنو قریظہ پہونچ کر ہی نماز ادا کی، لیکن بہت سے صحابۂ کرام نے فرمایا: ہم تو یہیں نماز پڑھیں گے، کیونکہ نبی ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ جلد سے جلد بنو قریظہ پہونچا جائے، پھر انھوں نے نبی ﷺ کے اس کلام کا مقصد سامنے رکھتے ہوئے عمل کیا کہ وہیں پر نماز پڑھی اور جلدی سے بنو قریظہ پہونچے، بعد میں جب نبی ﷺ کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا گیا تو آپ نے کسی پر نہ نکیر فرمائی نہ ہی ملامت کی۔ بخاری (946)

اسی طرح بعض امام کبھی حدیث کے ظاہر الفاظ کو لے کر اس پر عمل کر لیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرات تعلیماتِ اسلام کی روشنی میں اس کی مراد اور اُس کا مقصد سمجھ کر اُس پر عمل کرتے ہیں، اِس وجہ سے دونوں کے یہاں ایک ہی چیز کا حکم مختلف نظر آتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں قرآن و حدیث سے ہی مسائل کا حکم نکالتے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ابھی ایک حکم فرمایا، اور رسول کریم ﷺ موجود بھی ہیں، حکم کی تعمیل کرنے والے لوگ صحابۂ کرام جیسی عظیم الشان ہستیاں ہیں، ابھی حکم کئے ہوئے زمانہ بھی نہیں بلکہ چند ہی لمحے گذرے ہیں، پھر بھی حالات کے حساب سے ایک ہی حکم کا دو مطلب نکال کر دو طرح عمل کیا جارہا ہے، اور رسول کریم ﷺ دونوں کی تصویب فرمارہے ہیں، تو پھر..... جب نبی ﷺ کے وصال کو صدی دو صدی گذر گئی تو اگر دو امام اپنے اپنے علاقائی حالات، اپنے پاس موجودہ قرائن و شواہد اور اپنے علم کی گہرائی کے اعتبار سے ایک ہی حدیث کا دو مطلب نکال لیں اور دونوں کا مقصد نبی ﷺ کے حکم پر عمل کرنا اور شریعت کی پیروی کرنا ہو تو ایسا کیوں کر نہیں ہوسکتا کہ وہ دونوں حق پر نہ ہوں؟

چند لوگ تاریک رات میں کہیں پھنس گئے، قبلہ کی سمت کا پتہ نہیں چل رہا ہے تو

اس وقت تحری (اندازہ) کرنے کا حکم ہے کہ جس طرف دل مائل ہو اور لگے کہ اِدھر قبلہ ہے، اُسی جانب منہ کر کے نماز پڑھ لے۔

اب فرض کریں..... چار لوگ تھے، چاروں نے الگ الگ رُخ کر کے نماز پڑھی، اِس وقت شریعت تو کہتی ہے کہ: چاروں کی نماز صحیح اور اللہ کے یہاں مقبول ہوجائے گی، کیونکہ سبھوں کا مرجع اور ماخذ شریعت کا حکم تھا کہ: تحری کر کے نماز پڑھو۔

اسی طرح..... اگر کسی مسئلہ میں امام احمدؒ نے کچھ سمجھا، لیکن امام مالکؒ اُن کے خلاف گئے تو دونوں ہی حق پر ہیں، کیوں کہ دونوں کا مرجع اور ماخذ ایک ہی ہے۔ لہٰذا یہ ذہن نشیں رہے کہ: چاروں مذاہب حق پر ہیں اور اللہ کے یہاں مقبول ہیں۔

ایک ہی امام کی تقلید کیوں؟

اگر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) حق پر ہیں تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے؟ کہ جس کی تقلید کریں پوری پوری اسی کی تقلید کریں، ایسا کیوں نہیں ہے کہ ایک مسئلہ اِس امام اور دوسرا اُس امام کا لے لیں اور جب چاہیں جس پر چاہیں عمل کریں؟

تو عرض ہے کہ: پرانے زمانے سے ہی لوگوں کی سہولت پسندی، بے احتیاطی، بد دیانتی (Dishounesty) اور افتراق و انتشار (Separation & Dispersion) کو دیکھتے ہوئے صدیوں سے امت کا اس پر عمل رہا کہ عامی شخص (General People) کے لئے صرف ایک ہی امام کی تقلید واجب ہے۔ کیونکہ جب وہ شخص مجتہد نہیں ہے تو وہ کیسے سمجھے گا کہ کس کی رائے مضبوط

ہے،کس کی رائے راجح (Preferable) ہے،کون سی بات قرآن وحدیث اور اسلامی تعلیمات کے موافق ہے؟ کس کا فرمان حدیث سے زیادہ نزدیک ہے؟ چنانچہ وہ سہولت پسندی، ذاتی غرض اور نفسانی خواہشات کی خاطر آسان سے آسان مسئلہ تلاش کرے گا جو کہ اتباعِ ہویٰ (خواہشات کی پیروی کرنا) ہے،جس سے شریعتِ اسلام نے ہزاروں جگہ روکا ہے۔

یہ بات یقیناً مسلم ہے کہ: تقلیدِ شخصی (ایک ہی امام کی تقلید) فی نفسہ فرض یا واجب نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کو افتراق وانتشار سے محفوظ رکھنے کے لئے اِس کو واجب کیا گیا ہے۔

غور کریں! قرآن کریم کو سات طرح پڑھا جاتا تھا،لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قرآن کریم کو صرف ایک لغت (لغتِ قریش) میں جمع کرنے کا حکم دیا اور اسی پر سب کو جمنے کا امر فرمایا۔ جب کہ قرآن کریم کو ساتوں طریقوں سے پڑھنا صحیح تھا لیکن سیدنا عثمانؓ نے مسلمانوں کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے یہ حکم فرمایا کہ ایک ہی طرح قرآن کو پڑھا جائے۔ بالکل اسی طرح ......تقلید تو چاروں ائمہ کی درست ہے لیکن اس میں چونکہ خواہشات کی پیروی اور اختلاف وانتشار یقینی ہے،اسی وجہ سے تقلیدِ شخصی کو واجب کیا گیا ہے۔

دورِ حاضر کا تجربہ بتا رہا ہے کہ جو شخص تقلید کے وجوب کا منکر ہوتا ہے یا کسی ایک امام کا راستہ چھوڑ کر ''ہرجائی'' بننے کی کوشش کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی یہ آزادی اُسے کھلی گمراہی تک پہونچا دیتی ہے۔

اگر ایک ہی اِمام کی تقلید ضروری نہ ہو تو دین کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ کیسے؟ جی! آپ کا ہاتھ کٹ گیا،خون نکلا،آپ نے دیکھا کہ: حضرت امام شافعیؒ کے یہاں وضو نہیں ٹوٹتا،آپ بلا وضو ہی نماز کو چلے گئے۔ پھر گھر آئے،اپنی عورت کو

چھویا،دیکھا کہ امام شافعیؒ کے یہاں تو عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ گیا،سوچا کہ: ہاں! امام ابوحنیفہؒ کے یہاں عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا،جھٹ سے اِدھر آ گئے۔

یعنی آپ کی ساری توجہ صرف تن آسانی پر ہوگی،اپنا مطلب نکالنے کے لئے لوگ دن میں ٹوپی کرتے سے بھی زیادہ مسلک بدلیں گے،جس کے نتیجہ میں دین حقیقی دین نہیں رہے گا، بلکہ یہ ایک کھلونہ اور تماشا بن کر رہ جائے گا۔اسی وجہ سے پوری امت کے علماءِ حق کا اتفاق ہے کہ اب اِس زمانہ میں تقلیدِ شخصی یعنی ایک مکتبِ فکر کی تقلید کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جس کے اندر خود اجتہاد کی طاقت نہ ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ اس بابت فرماتے ہیں کہ: یہ لوگ اپنی غرض اور خواہش کے مطابق کبھی اُس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد بتاتا ہے اور کبھی اِس امام کی جو نکاح کو صحیح بتاتا ہے، جب کہ اس طرح عمل کرنا بالاتفاق ناجائز ہے۔ فتاوی (2/240)

اللہ ورسول کو چھوڑ کر امام کی تقلید ؟

کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ مقلدین حضرات اللہ ورسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر امام کی تقلید کرتے ہیں، جب کہ حق بات یہ ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کو چھوڑ کر کسی شخص کی پیروی اور اتباع وتقلید کرنے والا مسلمان ہی نہیں ہوسکتا۔

مقلد آدمی کسی امام کے قرآن وحدیث سے بنائے ہوئے قواعد واصول اور اس سے نکالے گئے مسائل کی تقلید اس لئے کرتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث پر صحیح طور پر عمل کر سکے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی امام کا کوئی قول قرآن وحدیث کے خلاف ہو تو نہ صرف اُسے چھوڑ دیا جائے گا، بلکہ دیوار پر مار دیا جائے گا، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: اگر میری بات قرآن وحدیث کے خلاف ہو تو اسے دیوار پر مار

دو۔لیکن یہ بات ضروری ہے کہ پوری شریعت کی روشنی میں پہلے اس قول کی تحقیق کی جائے گی کہ کہیں سے اس کی تائید تو نہیں ہو رہی ہے۔جس سے صاف طور پر یہ نتیجہ سامنے آرہا ہے کہ امام کی تقلید کسی بھی حالت میں اللہ ورسول ﷺ کے حکم سے روگردانی نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر صحیح طور عمل کرنے کا آسان اور بہترین راستہ اور محفوظ پہونچ (Approach) ہے۔

دراصل جنات وانسان میں سے ہر ایک پر ہر پل اور ہر لمحہ واجب ہے کہ وہ اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کرے،لیکن چونکہ اللہ کے بہت سے احکام ایسے ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے، چنانچہ وہ اِن مسائل میں ایسے لوگوں سے رجوع کرتے ہیں جو لوگ اِن کا علم رکھتے ہیں، کیونکہ وہ خود اللہ رسول ﷺ کے ارشادات کا مطلب صحیح طور پر سمجھتے ہیں،اس لئے ان کی پیروی کرنا درحقیقت اللہ ورسول ﷺ کی ہی اتباع ہے، کیونکہ یہ ائمہ انھیں اپنی ذاتی رائے نہیں بتاتے بلکہ قرآن وحدیث اور شریعت کا حکم بتاتے ہیں۔

اس لئے یہ کہنا کہ: ''مقلدین حضرات اللہ ورسول کو چھوڑ کر اماموں کی تقلید کرتے ہیں'' یہ بجائے خود بہت بڑی جہالت اور گمراہی ہے۔اور آپ کو یاد ہوگا کہ: تقلید اس مسئلہ میں واجب ہے جو قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو اور اُس شخص پر واجب ہے جو خود سے اجتہاد نہ کرسکتا ہو۔میں سمجھتا ہوں کہ تقلید کے سلسلہ میں صرف اسی ایک نکتہ کو پیش نظر رکھنے سے تقلید کی پوری حقیقت واضح ہوجائے گی،اب میں نے اتمام حجت کردی ،باقی اُن کا معاملہ اللہ کے سپرد۔اللہ سب لوگوں کو صحیح سمجھ کی توفیق دے۔آمین!

کیا تقلید شرک ہے؟

قرآن کریم میں ہے: **واذا قیل لھم اتبعوا ما أنزل اللہ قالوا بل نتبع ما ألفینا علیہ آباء نا أولو کان آباءھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون.** جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی چیز (قرآن) کی بات مانو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کرنا شرک اور کافروں کا عمل ہے؟

جی نہیں!اولاً تو اس آیت کا تعلق ایمانیات سے ہے،اور ایمانیات و قطعیات (جو چیزیں قرآن وحدیث سے قطعی طور پر ثابت ہیں) میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی، نہ ہی یہ جائز ہے، یہ بات بار بار گذر چکی کہ تقلید صرف اُن ہی مسائل میں کی جاتی ہے جو قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت نہ ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ: اِن باپ داداؤں کی تقلید کے حرام ہونے کی وجہ اللہ نے یہ بیان کی کہ: گرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہیں سمجھتے تھے۔یعنی وہ لوگ جاہل ،ناسمجھ اور گمراہی کی راستے پر تھے۔جب کہ ہم تو اُن حضرات ائمہ کی تقلید کرتے ہیں جو ہدایت پر تھے اور اللہ نے فرمایا: **اولئک الذین ھداھم اللہ فبھداھم اقتدہ.** یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی تو تم لوگ ان ہی کے راستے کی پیروی کرو۔اور یہ لوگ جو احکام مستنبط کررہے ہیں وہ اپنی رائے سے نہیں بلکہ قرآن وحدیث کے ہی اصولوں سے، لہٰذا ان کی بات ماننا درحقیقت اللہ کی ہی بات ماننا ہے۔

کیا علماء کرام کو رب بنالیا جاتا ہے؟

اللہ نے فرمایا:**اتخذوا أحبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله.** کہ اُنھوں نے اپنے دینی پیشواؤں اور رِبیوں کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنالیا۔یعنی وہ اگر چہ اِن پیشواؤں اور نام نہاد علماؤں کی عبادت نہیں کرتے تھے،لیکن اُن کی باتوں کو بلا چون و چرا مان کر اس پر عمل کرتے تھے۔پس علماء کی باتوں کو بلا دلیل مان کر اس پر عمل کرنا گمراہی ہے جیسا کہ اللہ رب العزت نے نصاریٰ کی روِش اور ان کا طریقہ بیان کیا؟

تو.......جاننا چاہئے کہ نصاریٰ نے اپنے عالموں اور پیشواؤں کو قانون ساز اور شریعت بنانے والا بنادیا تھا،اور ان کے رہبان و ربی اس قدر بدتمیز تھے کہ دین و شریعت میں خود سے تبدیلی اور قطعی آیتوں میں کانٹ چھانٹ کر کے حکم کو بدل دیتے تھے اور ان کے ماننے والے انھیں غلطیوں سے معصوم سمجھتے تھے،اس لئے اللہ نے اُن کی مذمت کی اور انھیں گمراہ قرار دیا۔

جب کہ ہم نہ تو کسی عالم و مجتہد کی کوئی ایسی بات جو قرآن و حدیث اور نصوص کے خلاف ہو؛ مانتے ہیں، نہ ہی انھیں معصوم اور غلطیوں سے پاک سمجھتے ہیں اور نہ تو انھیں قانون ساز اور شریعت بنانے والا سمجھتے ہیں، چونکہ ہم میں اجتہاد کی اور دلائل سے مسائل کو ثابت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اسی لئے ہم ان کی تشریح و توضیح پر عمل کرتے ہیں، اور اُنھیں صرف اور صِرف شارح (اللہ و رسول ﷺ کی باتوں کا صحیح مطلب بتانے والا) خیال کرتے ہیں۔

صحابۂ کرام مقلد کیوں نہیں تھے؟

اگر تقلید اسی قدر ضروری اور واجب ہے تو صحابۂ کرام کس امام کے مقلد تھے؟

جب تک رسول اللہ ﷺ باحیات تھے اس وقت تک تقلید نہیں تھی، بلکہ جو صحابہ آپ کے قریب رہتے تھے وہ آپؐ سے پوچھ کر اتباع کیا کرتے تھے، کیونکہ جو کھیت دریا کے پاس ہوتا ہے اُسے نہر کے پانی کی ضرورت نہیں پڑتی، پہلی صف کے مقتدیوں کو مکبر کے آواز کی ضرورت نہیں رہتی، حضرات صحابہ پہلی صف کے مقتدی ہیں، وہ تو ڈائرکٹ نبی ﷺ سے فیض لینے والے ہیں، انھیں آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کی تقلید کی حاجت نہیں، اس لئے یہ سوال کرنا کہ صحابۂ کرام کس کے مقلد تھے؛ بجائے خود ایک بڑی جہالت ہے۔

لیکن ہاں! رسول کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابۂ کرام میں دو طرح کے لوگ تھے، مجتہد صحابۂ کرام خود سے اجتہاد کر لیتے تھے، جیسے حضرت ابن مسعودؓ و ابن جبلؓ و ابن عباسؓ رضی اللہ عنہم۔ دوسرے وہ صحابہ جو مجتہد نہ تھے، وہ مجتہدین صحابہ کی تقلید کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل سے گذرا۔ حدیث کی کتابوں میں مجتہدین صحابۂ کرام کے ہزاروں ایسے فیصلے موجود ہیں جن میں غیر مجتہدین صحابہ نے اِن حضرات کی بات پر بلا چون و چرا عمل کیا۔ یہی تو تقلید ہے۔

کیا دین مکمل نہیں ہوا ؟

کیا دین مکمل نہیں ہوا ہے؟ اللہ رب العزت نے فرمایا: **أليوم أكملتُ لكم دينَكم وأتممتُ عليكم نِعمَتي.** مائدہ (3) میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمت پوری پوری دے دی۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین مکمل ہو گیا، جب دین مکمل ہو گیا تو پھر تقلید کی اور ائمۂ مجتہدین کی پیروی کی ضرورت کیوں ہے؟

یہ سوال غلط فہمی کی بنیاد پر ہوتا ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ (جن کی تفسیر اصح التفاسیر ہے، جن کے لئے نبی ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! اِسے قرآن کی تفسیر کا علم عطاء فرما) فرماتے ہیں: کہ اللہ پاک نے اِس آیت کے اندر یہ خبر دی کہ آج دین کے تمام حدود و فرائض اور احکام و آداب مکمل کر دئے گئے، اب اس میں نہ کسی چیز کا اضافہ ہو سکتا ہے، نہ ہی کسی چیز کی کمی۔

آپ غور کریں کہ اجتہاد کے اصول وقوانین خود اللہ رب العزت نے قرآن میں اور نبی ﷺ کے واسطہ سے حدیث میں بیان کئے، چنانچہ اِن اصول کے ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں گے، وہ سب ایک حیثیت سے قرآن کے ہی بتائے ہوئے احکام میں شامل ہوں گے۔ زمانے کے اعتبار سے جو نِت نئے مسائل پیش آتے ہیں اور مجتہدین حضرات قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حکم نکالتے ہیں یہ دین میں زیادتی نہیں، بلکہ یہ حقیقت میں احکامِ قرآنی کی ہی توضیح ہے۔

ورنہ تو اس آیت کا سہارا لے کر کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ تمام حلال وحرام بیان کئے جا چکے، اس لئے اب دنیا میں جتنے خرافات و واہیات پیدا ہو رہے ہیں، سب کے سب جائز ہیں، کیونکہ اُس کو حرام کرنا دین میں زیادتی کرنا ہو گا۔ یہ غلط فہمی نہ ہو

29

، کیونکہ یہ اجتہادت اور عوام کے لئے اس کی تقلید و پیروی کرنا حقیقت میں قرآن و حدیث کے ہی احکام و اصول پر مبنی ہیں۔

اگر دین مکمل ہی ہو گیا ہے کہ تو پھر رسول کریم ﷺ نے یہ کیوں فرمایا: میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کرنا۔ اور یہ کیوں رہنمائی کی کہ: میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں جن کی بھی اقتداء اور پیروی کرو گے ہدایت پالو گے۔ اور رُکئے! قرآن نے یہ کیوں کہا کہ: اگر تم نہیں جانتے ہو تو علم والوں سے پوچھو۔؟؟؟ ظاہر ہے دین کی تکمیل اور پورے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اب شریعت میں نئے مسائل کا حکم نہیں نکالا جائے گا۔

اگر آپ نے یہ بات ذہن میں رکھی ہوتی کہ ’’تقلید اُس شخص پر واجب ہے جو خود اجتہاد نہ کر سکتا ہو، اور اُن مسائل میں واجب ہے جو قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کئے گئے ہیں، بلکہ فروعی مسائل میں مجتہدین حضرات جو مسائل قرآن و حدیث کی روشنی میں نکالتے ہیں، ان میں تقلید کرنا ضروری ہے‘‘ تو آپ کے ذہن میں یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اندھی تقلید کسے کہتے ہیں؟

اگر کوئی اندھا کسی اندھے شخص کے پیچھے راستہ چلے اور یہ سمجھے کہ وہ مجھے میری منزل کی طرف لے جائے گا تو ظاہر ہے آگے چل کر دونوں کو ٹھوکر لگے گی اور راستہ دِکھانے والا، اس کے پیچھے چلنے والا دونوں کسی گڑھے میں گر جائیں گے، یہی اصل میں اندھی تقلید ہے۔

لیکن اگر کوئی اندھا شخص کسی آنکھ والے انسان کے پیچھے راستہ چلے گا تو گڑھے میں گرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اسے کوئی عقلمند انسان اندھی تقلید نہیں کہہ سکتا۔

بالکل اِسی طرح ائمہ اربعہ کے مقلدین ہیں کہ وہ کسی جاہل اور عقل سے کورے شخص کی تقلید نہیں کرتے بلکہ وہ اُن لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں جوشریعت کی گہرائی میں دیکھنے والی آنکھیں رکھتے تھے،جن کی نگاہوں میں اللہ ورسول ﷺ کے احکام کی حقیقتیں واضح دکھائی دیتی تھی، جوعلم وفضل اور دانائی میں وقت کے امام تھے اور اب تک ہیں، وہ لوگ شریعت کے احکام سے واقفیت کے اعتبار سے بینا تھے اور ہم لوگ اس اعتبار سے اندھے، چنانچہ ہم شرعی احکام واصول کے نابیناؤں پر ضروری اور لازم ہے کہ ہم اُن بیناؤں کے پیچھے چلیں اور اُن کی پیروی کریں، اس لئے اِسے اندھی تقلید اور اِن مذاہب اربعہ (چاروں مذاہب) پر چلنے والے کو اندھا مقلد نہیں کہا جا سکتا۔

ائمہ کرام نے اپنی تقلید سے منع کیا ہے

اگر آپ ائمۂ اربعہ کے مقلد ہیں تو ہر مسئلہ میں اُن کی تقلید کریں، اور اُن لوگوں نے اپنی تقلید سے روکا ہے، امام احمد بن حنبلؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ سب نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے۔ تو یہاں ان کی تقلید کا اصل اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ ان کی تقلید کرتے ہوئے اُن کی تقلید سے رُک جائیں؟

یہ سوال اور یہ شبہ واہیہ اور بے کار ہے، دراصل مجتہد کے لئے کسی اور کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے، اور ائمہ کے یہ اقوال اُن ہی لوگوں کے لئے جو مجتہد ہے، یقیناً اُن لوگوں کے لئے تقلید کرنا درست نہیں ہے جو اجتہاد کر سکتے ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ عوام کو علماء کی اور اپنی تقلید سے روک دیں جب کہ یہ واجب اور ضروری ہے۔ بھلا سوچیں! اللہ تعالی فرماتا ہے: تم اولوالامر یعنی اہلِ فقہ کی پیروی کرو، اور یہ کہیں کہ: اِن کی پیروی نہ کرو؟ یہ کیسے ممکن ہے۔؟ اللہ کہے: اگر تم نہیں جانتے ہو تو

علم والوں سے پوچھو۔ اور یہ حضرات کہیں کہ: مت پوچھو؟ یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے ؟ رسول کریم ﷺ فرمائیں کہ: اللہ کی مار ہو ان لوگوں پر جب وہ جانتے نہیں تھے تو پوچھتے بھی نہیں تھے۔ اور یہ حضرات یہ کہیں کہ: نہیں جانتے ہو تب بھی مت پوچھو ؟ سبحان اللہ! اِن حضرات کی شان اس سے بہت بلند ہے۔

دراصل اِن ائمہ حضرات نے متفقہ طور پر تقلید سے اِس طرح منع فرمایا ہے کہ: کسی شخص کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ہماری باتوں کو لے لے اور یہ تحقیق بھی نہ کرے کہ ہم نے یہ بات کہاں سے کہی ہے۔

یعنی اِن کا منشاء یہ ہے کہ ہماری باتوں کو لینے سے پہلے اُس کی تحقیق کر لے کہ ہم نے جو کہا ہے وہ صحیح ہے بھی کہ نہیں؟ اور اِس کی تحقیق ہم آپ جیسے عوام نہیں کر سکتے، بلکہ یہ تحقیق وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اِس کے اہل، مجتہد اور اِس مقام پر ہیں کہ اُس کی تحقیق کر سکیں۔ مگر جو لوگ اِس مقام پر ہیں ہی نہیں، وہ کیسے پتہ لگائیں گے؟

اِس لئے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ ائمہ حضرات نے اُن لوگوں کو تقلید سے منع کیا ہے جو اجتہاد کے اہل ہیں، اُن لوگوں کو نہیں جو عامی اور عوام ہیں۔

صحیح حدیث میرا مسلک

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: جب صحیح حدیث سامنے آجائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے مقلدین اُن کی اِس بات پر عمل نہیں کرتے ، بلکہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ''جب صحیح حدیث سامنے آجائے تو وہی میرا مسلک ہے'' کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جہاں کہیں صحیح حدیث نظر آئے اس پر بلاسوچے سمجھے عمل کرلیا جائے ، نہ ہی یہ کسی عالمِ حقانی کا مسلک ہے۔ اس لئے کہ بہت سی صریح وصحیح احادیث ایسی ہیں جن کے مضمون میں مکمل تعارض ہے کہ ایک حدیث میں کسی چیز کے حرام ہونے کی بات ہے تو دوسری حدیث اسی چیز کی حِلت ثابت کررہی ہے۔

ذخیرۂ احادیث کا ادنیٰ سا مطالعہ کرنے والا شخص بھی اس بات سے واقف ہے کہ بہت سی صحیح حدیثیں صحیح سند کے ساتھ مروی ہونے کے باوجود معمول بہا (عمل کئے جانے کے لائق) نہیں ہیں۔ مثلاً: مسلم اور سنن کی روایت ہے کہ: نبی ﷺ نے اونٹ کے گوشت کے بعد وضو کرنے کا حکم فرمایا۔ لیکن اس حدیث پر کسی کا عمل نہیں ؟ جب کہ یہ حدیث صحیح بھی ہے اور صریح بھی۔ اِس طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض صحیح وصریح حدیث کا ہونا عمل کرنے لئے کافی نہیں، بلکہ اُس پر عمل کرنے سے پہلے اس حدیث کا دوسری حدیثوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا، اس کے بعد جو رائے صحت کے ساتھ سامنے آئے گی ،اُسے ہی قبول کیا جائے گا۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر دو مختلف طرح کی حدیثیں آتی ہیں تو حضرات احناف اُس کا صحیح محمل تلاش کرتے ہیں اور حدیثوں کے تعارض کو ختم

کر کے عمل کرتے ہیں۔ اب اِس وقت یہ اعتراض کرنا کہ احناف صحیح حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں، صحیح نہیں ہے، بلکہ ناواقفیت (جہالت) یا شر انگیزی (ہٹ دھرمی) پر مبنی ہے۔

تحقیق کیا ہے اور کیسے کی جاتی ہے؟

تحقیق دراصل نام ہے: مسائل کو دلائل سے ثابت کرنا۔ یعنی کسی مسئلہ کو ہر پہلو سے دیکھنا، اس کے دونوں پہلوؤں کی دلیلیں دیکھنا اور اس میں غور وفکر کر کے کسی موقف تک پہونچنا۔ بہت سے لوگوں کو تحقیق کا خبط ہوتا ہے، وہ تحقیق کے نام پر ایک طرفہ دلیل دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، جب کہ تحقیق کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں طرف کے پہلوؤں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ جو لوگ ایک طرفہ فیصلہ کرتے ہیں وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہوتا کہ ہم تحقیق کرتے ہیں، تقلید نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ آپ صرف اتنا کرتے ہیں کہ: کسی خاص عالم کی کتاب بلکہ اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں کہ اس مسئلہ کے تحت انھوں نے کیا لکھا ہے اور آپ وہاں کے حوالہ سے عمل کرتے اور کرواتے ہیں، کیا اسی کا نام تحقیق ہے؟ چلئے ذرا اور آگے بڑھیں تو آپ یہ کرتے ہیں کہ کسی حدیث کے تحت کسی محدث نے کچھ کہا ہے اور کسی نے اس کو لکھا ہے تو آپ اس محدث کی بات پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتے ہیں ،کیا یہی تحقیق ہے؟ مثلاً ایک حدیث کے تحت امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ: یہ حدیث ضعیف ہے۔ تو آپ اُسے آنکھیں بند کر کے ضعیف قرر دے دیتے ہیں، کیا یہی تحقیق ہے؟ آپ نے تو یہاں امام ترمذیؒ کی بات بلا حیل و حجت تسلیم کرلی، یہ تو تقلید ہوئی، تحقیق تو جب ہوتی جب آپ امام ترمذیؒ کے محتاج نہ ہوتے، آپ خود

سے دیکھتے اور اپنی تحقیق میں کسی کی بات پر بغیر دلیل کے اعتماد نہ کرتے۔

لیکن افسوس! آپ ایسی تحقیق سے عاجز ہیں اور مکمل عاجز اور بالکل عاجز، نہ ہی آپ کے عامی شخص کے پاس اتنا علم ہے۔آپ تو تقلید کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، پھر بھی زبان پر دعویٰ ہے کہ ''ہم محقق ہیں'' آپ میں سے وہ لوگ بھی تو ہیں جنھیں صرف اس بات کی خبر نہیں کہ: تحقیق کس کو کہتے ہیں؟ تحقیق کیسے ہوتی ہے؟ اس کے کیا کیا مراحل ہیں؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ آپ صرف ''تحقیق'' کے لفظ کی ہی تحقیق کر کے دکھائیں اور کچھ اِس شان سے اس میں تقلید کا شبہ بھی نہ پایا جائے؟ آپ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہیں گے: ''کسی مسئلہ کو دلیل سے ثابت کرنا'' تحقیق کہلاتا ہے۔لیکن یہ بات آپ نے کہاں سے لائی؟ ظاہر ہے کتاب و سنت میں تحقیق کی یہ تعریف موجود نہیں ہے، لازماً آپ نے اس میں کسی کا دامن تھاما ہے، تو کیوں کسی کی تقلید کی؟ جب کہ آپ خود پر محقق کا لیبل لگائے ہوئے ہیں؟

اس لئے ذہن نشیں کر لیں اور اچھی طرح سمجھ بوجھ لیں کہ: تحقیق کا مطلب ہے کسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر، ہر ہر دلیل کا ایک ایک کر کے تجزیہ کرنے کے بعد اس پر کوئی حکم لگانا، اور یہ درجہ ہر ایک شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا، کچھ لوگ ایک دو ترجمہ دیکھ کر محقق بن جاتے ہیں، یا ''Google'' پر سرچ کر کے تحقیق پیش کرتے ہیں، اسے تحقیق نہیں بلکہ تقلید کا اعلیٰ نمونہ کہا جائے گا۔اگر یہی تحقیق ہے تو آج تحقیق کی ایک نئی تعریف سمجھ میں آئی ہے.....!

اجتہاد اور مجتہد

اجتہاد کہتے ہیں کسی کام میں پوری کوشش کرنا، شریعت میں اس کا استعمال یہ ہے کہ: کسی غیر منصوص علیہ مسئلہ کو قرآن و حدیث سے اخذ کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا۔

ہر شخص اجتہاد نہیں کر سکتا، کیونکہ اجتہاد کے لئے بہت سی شرطیں ہیں، جس شخص میں یہ شرائط پائی جائیں گی وہی شخص اجتہاد کرنے کا اہل ہے۔یہ ایک انتہائی اہم پہلو ہے جسے اکثر لوگ نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔

غور کریں! نماز کی شرطوں میں سے ایک شرط وضو کرنا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس شرط کو ادا نہ کرے اور بلا وضو ہی نماز پڑھ لے تو کیا اُس کی نماز صحیح ہو جائے گی؟

سبحان اللہ! اُس کی نماز تو کیا ہوگی؟ بلکہ اس پر اُلٹا اِس کا وبال آئے گا اور بغیر وضو کے نماز پڑھنا اُس شخص کی تباہی اور ہلاکت کا سامان ہوگا۔

ٹھیک اِسی طرح.....اجتہاد کا معاملہ ہے کہ جو شخص اپنے اندر اجتہاد کی شرطیں موجود رکھتا ہے، وہی اجتہاد کر سکتا ہے، جو اِس سمندر میں تیرنا نہیں جانتا، اگر وہ اس میں کودے گا تو ڈوب کر ہلاک ہو جائے گا۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ''ارشاد الفحول'' (251) میں اجتہاد کرنے کے لئے یہ شرائط بیان کی ہیں:

(1) مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عربی علوم (صرف، نحو، بلاغت وغیرہ) پر عبور حاصل ہو، عربی زبان کے نشیب و فراز (اونچ نیچ) اور اسلوبِ بیان سے واقف ہو، اس لئے کہ اصول (قرآن و حدیث) عربی زبان میں ہیں۔پس اجتہاد کرنے کے لئے عربی میں پوری مہارت ضروری ہے۔

ذرا آپ سوچیں کہ جو لوگ قرآن و حدیث کے ترجمہ کی تقلید کرتے ہوئے اجتہاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیا اُن کا مجتہد بن بیٹھنا صحیح ہوگا؟ حالانکہ وہ جس ترجمہ کو دیکھ کر اجتہاد کرنے کی سعیِ لا حاصل میں مبتلا ہیں، ان کو یہ جانچنے اور پَرکھنے کی بھی لیاقت تک نہیں کہ یہ ترجمہ صحیح ہے کہ غلط؟ کمال ہے صلاحیت کی!

(2) قرآنی علوم (تفسیر، اسبابِ نزول، ناسخ و منسوخ) سے اچھی طرح واقف ہو۔

(3) علومِ حدیث (حدیث کی اصطلاحات، علم اسماء الرجال وغیرہ) کا پورا پورا علم رکھتا ہو۔

(4) جس مسائل پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، اُن سے واقف ہو۔ کیونکہ جن مسائل پر اجماع ہو چکا ہے، اس میں اجتہاد کرنے کی گنجائش نہیں، اگر وہ اِس سے بے خبر ہوگا تو نہ جانے کہاں کہاں اِجتہاد کر بیٹھے گا؟

(5) اصولِ فقہ کا ماہر ہو۔ فقہی مسائل نہیں بلکہ فقہ کے اصول وقواعد میں پوری دسترس رکھتا ہو۔

(6) وہ شخص اعلیٰ درجہ کا ذہین وفہیم اور متقی و پرہیزگار ہو، اور اس کے اجتہاد میں نفس پرستی کا عمل دخل نہ ہو۔

علماء کا اتفاق ہے کہ مجتہد کے اندر یہ ساری شرطیں پائی جانی ضروری ہیں، اگر کسی شخص کے اندر اِن میں سے کوئی ایک بھی شرط نہ پائی گئی تو وہ شخص اجتہاد نہیں کر سکتا، بلکہ وہ عامی کہلائے گا اور عامی کے لئے تقلید کرنا واجب ہے۔

علامہ شوکانیؒ نے اس معاملہ میں قولِ فیصل کے طور پر اجتہاد کے لئے یہ شرائط ذکر کی ہیں، خدا کے واسطہ اجتہاد کرنے سے پہلے حضرت العلام کی بیان کردہ اِن شرائط کو تو اپنے آپ میں پیدا کر لیں پھر آپ شوق سے مجتہد بنیں!

کیا نا اہل اجتہاد کر سکتا ہے؟

جس طرح سونا کے معاملہ میں سنار (Glod Smith) کی تحقیق مانی جائے گی، لوہار (Black smith) کی تحقیق نہیں، ٹھیک اسی طرح دین کے معاملہ میں دین کے ماہرین ہی کی تحقیق مانی جائے گی، کسی ڈاکٹر یا انجینئر کی نہیں۔ وہ شخص کتنا بڑا بے وقوف ہوگا جو سونا کا کھرا یا کھوٹا معلوم کرنے کے لئے سنار کے پاس جانے کے بجائے لوہار کے پاس جائے؟ یعنی دینی مسائل کی تحقیق کرنے کے لئے ائمۂ مجتہدین کا دامن چھوڑ کر اُن لوگوں کی بات مانے جو حدیث کی ابجد تک سے واقف نہیں؟

رسول کریم ﷺ سے کسی شخص نے قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کب آئے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کر۔ سائل نے عرض کیا: یا رسول اللہ! امانت کس طرح ضائع ہوتی ہے؟ فرمایا: **اِذا وُسد الامرُ الی غیر اھلہ فانتظر السّاعة.** جب کوئی معاملہ نا اہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ بخاری (59)

اہل (لائق) اور نا اہل (غیر لائق) کا فرق خود نبی ﷺ نے بیان فرما دیا کہ جب نا اہل کو کوئی معاملہ سپرد کر دیا جائے تو یہ قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ غور کریں! جو لوگ کہتے ہیں: ''ہر شخص قرآن وحدیث سے مسائل کا حل نکال سکتا ہے اور مجتہدین کی ضرورت نہیں''۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم تو مجتہدین کے رتبہ تک ہرگز نہیں پہونچ سکتے، اب اگر ہم نے اُن کی تحقیق پر عمل کر لیا تو یہ شرک کہلایا جائے، اور اگر ہم اپنی ناقص عقل کے ذریعہ اجتہاد کریں اور قرآن وحدیث کے دو لفظ جان کر مجتہد بن جائیں تو یہ شرک و بدعت کیوں نہیں؟ ہم میں سے جو لوگ اَن پڑھ ہیں وہ کیا کریں گے؟ اس لئے یہ بات ہر وقت اور ہر لمحہ ذہن نشیں

رہے کہ: نااہل اور غیر مجتہد شخص کے لئے چاروں اماموں میں سے کسی ایک کی پیروی کرنا بہت ہی ضروری ہے۔(اب اتنا زیادہ اجتہاد کا شوق نہ فرمائیں کہ قیامت قریب ہی آجائے)

ضروری عرض

ماقبل میں یہ بات آچکی ہے کہ اسلام کے اندر اصل اہمیت نیک اور اچھے عمل کی ہے، فروعی مسائل میں بہت زیادہ اختلاف وہٹ دھرمی اہلِ حق کی پہچان نہیں ، نہ ہی یہ سلف صالحین کا طریقۂ کار رہا ہے، لیکن چونکہ اِن لوگوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے فروعی مسائل کے تعلق سے یہ وسوسہ ڈالنا شروع کیا ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث یہ کہتی ہے اور ائمۂ مجتہدین ان مسائل میں باطل پر تھے، حق وہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔ تو ہم مجبور ہو گئے کہ اُن مسائل میں سے اُن چند اہم اور سلگتے ہوئے مسائل پر قرآن وحدیث کی روشنی ڈالیں اور اسلاف کا صحیح موقف پیش کریں جس سے حقیقت اچھی طرح کھل کر سامنے آجائے۔

اللہ کہاں ہے؟

یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے، کیونکہ اس کا تعلق اللہ عزوجل کی ذات سے ہے، اور یہ بھی ہے کہ: **تفکروا فی آلاء اللہ ولا تتفکروا فی اللہ.** طبرانی (683) اللہ کی ذات کے بارے میں غور وفکر نہ کرو بلکہ اللہ کی مخلوقات اور اس کی کائنات میں غور کرو۔ شیطان کے پاس انسان کو بہکانے کے اور اسے سیدھے راستے سے ہٹانے کے ذرائع میں سے یہ ایک انتہائی مضبوط ذریعہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ: اللہ کہاں سے آیا؟ وہ کب پیدا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟ **نعوذ باللہ من ذلک.** جب کہ اِن مسائل کی نزاکت وتقدیس کا یہ عالم ہے کہ: ایک بار امام دارالہجرۃ حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ: اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا مستوی ہونا معلوم ہے، لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں اور اِس کے بارے میں سوال کرنا گمراہی اور بدعت ہے۔

لیکن......موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ کو جس طرح ''حق و باطل'' کا معیار بنایا جا رہا ہے وہ اہلِ ہوش سے پوشیدہ نہیں۔ اِس سلسلہ میں اہلِ حق کا ہمیشہ وہی مسلک رہا ہے جو قرآن وحدیث میں مذکور ہے: **الرحمن علی العرش استویٰ** ۔ طٰہ (5) اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ اور اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جس میں یہ صراحت موجود ہے کہ اللہ عزوجل عرش پر مستوی ہے۔

اسی طرح مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک بچی سے دریافت کیا: اللہ کہاں ہے؟ اس بچی نے جواب دیا: آسمان میں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اِسے آزاد کردو کیونکہ یہ مسلمان ہے۔ مسلم (1227)

ایک حدیث میں ہے:**اِرحموا من فی الارض یرحَمکم من فِی السّماءِ.** اَبوداؤد(4943)تم زمین والوں پر رحم کرو،آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اِن تمام آیات واحادیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے،لیکن دوسری طرف ہم اہلِ حق کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے پاک ہے، کیونکہ جگہ اور مکان ختم ہوجانے والی چیز ہے، جو اللہ کے شایانِ شان نہیں، بلکہ اس کی اُلوہیت(خدائی) کے خلاف ہے۔

دوسری جانب اللہ کا ارشاد ہے:**وھوا اللّٰہُ فی السَّماءِ وفی الأرضِ ۔ الانعام** (3)اللہ زمین وآسمان میں ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان ہرجگہ موجود ہے۔یعنی دوطرح کی بات ہوگئی،ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں عرش پر ہے۔دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان ہرجگہ موجود ہے۔

حق اور صحیح مسلک یہ ہے کہ:اللہ تعالیٰ کسی جگہ اور مکان جیسے عرش وکرسی وغیرہ کا محتاج نہیں، بلکہ وہ ان سب چیزوں سے ماوریٰ اور بے نیاز ہے۔اس لئے اہلِ حق کہتے ہیں کہ:اللہ تعالیٰ اپنے علم اور اپنی قدرت کے اعتبار سے ہرجگہ موجود ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے جگہ سے پاک ہے۔

ہرجگہ موجود ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہرجگہ موجود ہے کہ اِس گھر میں بھی اس کی ذات ہے اور اُس گھر میں بھی،کرسی پر بھی، چارپائی پر بھی، بلکہ ہر ہرجگہ۔نہیں! یہ تو اللہ کی شان کے خلاف ہے۔اہلِ حق جب بھی یہ کہتے ہیں: اللہ ہرجگہ موجود ہے،تو اس کا مطلب اور کہنے کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم اور اپنی قدرت کے اعتبار سے ہرجگہ موجود ہے۔

جیسے کہ اللہ رب العزت خود فرماتے ہیں:**مایَکُونُ مِن نجویٰ ثلثلة الا ھو رابعُھم ولا خَمسة الا ھُو سادسِھم ولا أدنیٰ من ذٰلک ولا أکثر الا ھُو مَعھم.مجادلہ**(7)جب تین لوگ سرگوشی کرتے ہیں تو ان میں کا چوتھا اللہ ہوتا ہے،اور جب چار لوگ ہوتے ہیں تو پانچواں اللہ اور جب پانچ لوگ مل کر باتیں کرتے ہیں تو اللہ اُن کا چھٹا ہوتا ہے،اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی رہو۔

دوسری آیت ہے:**نحنُ أقرب الیہ من حبل الوَرِید.** قٓ(16)ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

ایک آیت میں ہے کہ:**لا تحزن ان اللہ معنا.** توبہ(40)غم نہ کرو،اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

قرآن کی بہت سی آیتیں اِس پر شاہد ہیں کہ اللہ ہرجگہ موجود ہے،لیکن چونکہ وہ مکان اور جگہ سے پاک ہے،اِن سب چیزوں کا محتاج نہیں،اسی لئے علماءِ حق نے ان آیتوں میں ایسی تاویل کی جو اللہ کے شایانِ شان اور اس کی خدائی وبرتری اور بے نیازی پر دلالت کرتی ہے۔اور ان کا صاف اور محتاط بے غبار مسلک یہ ہے کہ:اللہ تعالیٰ ذات کے اعتبار سے جگہ سے پاک ہے،لیکن وہ اپنے علم اور اپنی قدرت کے اعتبار سے ہرجگہ موجود ہے۔

البتہ.....اُوپر جن آیات واحادیث میں ہے کہ:اللہ تعالیٰ آسمان میں عرش پر ہے۔تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ذاتی اعتبار سے آسمان میں عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔چونکہ بلندی اور فوقیت اس کے شایانِ شان ہے،اس لئے اللہ نے اپنے لئے یہ انداز اختیار کیا ہے۔جیسے ایک آیت میں ہے:**الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه.** اچھی بات اسی کی طرف چڑھتی ہے اور نیک عمل اسی کی

طرف اٹھایا جاتا ہے۔سمجھ میں صاف آ گیا کہ بلندی اوراوپر ہونا اللہ عزوجل کے شان کے مطابق ہےاس لئے اللہ کے لئے اس طرح بولا جاتا ہے کہ: وہ آسمان میں ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ: کیا اللہ کے بارے میں اس طرح بے باک ہوکر گفتگو کرنے کی اجازت ہے؟ کیا رسول کریمﷺ نے یا صحابۂ کرام نے اس مسئلہ کے متعلق بحث کی ہے؟ یا اِس طرح بحث کر کے اللہ کو کسی جگہ سے ڈھونڈ کر باہر نکالنے کا ارادہ ہے؟ کیا اس پر کسی کے ایمان کا دارو مدار ہے؟ رسول اللہﷺ نے اللہ کی ذات کے بارے میں بحث کرنے سے منع فرمایا ہے، سلفِ صالحین کا منہج یہ تھا کہ اسے عالم السرائر کے حوالے سونپ کر خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔لیکن وہ ہیں کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے عمل کے بجائے ''اس کی کھوج'' میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟ حیرت ہے انداز فکر پر! کچھ تو حیاء کریں! میں سمجھتا ہوں کہ خوف خدا کا کچھ حصہ تو اُن میں ضرور ہی ہوگا۔

اگر آپ اللہ کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو قرآن سے دریافت کریں کہ وہ خدا کہاں جلوہ افروز ہے؟ قرآن نے تو یہ بتایا کہ: ہم تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔ہم تمہارے ساتھ ہیں۔جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو ان سے کہہ دیں کہ میں ان کے قریب ہوں۔کیا تم اپنے آپ میں غور وفکر نہیں کرتے؟

رفع یدین

نماز کے شروع میں تکبیر کہتے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھانا سب کے نزدیک سنت ہے، لیکن رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے میں ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ: یہ بہتر نہیں ہے۔امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ سنت مؤکدہ ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مکروہ یعنی بہتر نہیں ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں نبیﷺ سے روایات دونوں طرح کی وارد ہوئی ہیں، اِسی طرح صحابہ اور تابعین کا عمل بھی مختلف رہا ہے، چنانچہ جس مجتہد نے جس کو راجح سمجھا، اس پر عمل کیا، آئیں ذرا تجزیہ کریں کہ کس طرح کی روایات عمل کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔

رفع یدین (ہاتھوں کو اٹھانے) کی روایتیں:

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے دیکھا کہ جب نبیﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھاتے، یہی عمل رکوع میں جانے کے وقت، رکوع سے سر اٹھانے کے وقت کرتے، مگر سجدوں میں یہ عمل نہ کرتے۔بخاری (736)

رفع یدین کے سلسلہ میں یہ سب سے مضبوط دلیل مانی جاتی ہے، اور بھی اس طرح کی کچھ روایات ہیں جن سے رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے۔

لیکن....حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مشہور شاگرد حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے ابن عمرؓ کو نماز کے شروع کے علاوہ میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہیں

دیکھا۔مصنف ابن ابی شیبہ(2467)

کیا کسی صحابی سے ممکن ہے کہ وہ اپنی روایت کے خلاف عمل کرے؟ ہر گز نہیں! تو ظاہر سی بات ہے کہ ان کی روایت کو ظاہر پر نہ رکھا جائے گا، کیونکہ اصولِ حدیث کا یہ قاعدہ مشہور ہے کہ: جب کسی راوی کا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کے عمل کو ترجیح دی جائے گی، اس کی روایت کو نہیں۔ کیونکہ انھوں نے نبی ﷺ سے جو دیکھا یا سنا، اسے بلا کم و کاست بیان کر دیا، لیکن عمل تو اسی پر کریں گے جو انھوں نے نبی ﷺ کی صحبت سے حاصل کیا اور اسے سمجھا۔

دوسری دلیل: حضرت ابوحمید ساعدیؓ نے دس صحابہ کی موجودگی میں نماز پڑھی اور اس میں رفع یدین کیا۔ابن ماجہ(863)

اس روایت سے کچھ یوں دلیل دی جاتی ہے کہ: حضرت ابوحمیدؓ نے کئی حضرات صحابہ کرام کی موجودگی میں نماز پڑھی اور اس میں رفع یدین کیا، لیکن کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ پس ثابت ہوا کہ رفع یدین کرنا اولیٰ ہے۔

اگر اِسی اُسلوب سے دلیل دی جاتی ہے تو پھر کیا میں آپ کو اِس سے بھی مضبوط راستہ نہ بتاؤں؟

حضرت عمرؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔(طحاوی) اس روایت کے بارے میں علامہ زیلعی ''درایہ'' میں فرماتے ہیں کہ: یہ روایت صحیح ہے۔''الجوہر النقی(2/75) میں ہے کہ: اس کی سند مسلم کے درجہ کی ہے۔

حضرت علیؓ نماز کے شروع کے علاوہ میں ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے۔بیہقی(2637) اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔

حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین، حضرت علیؓ بن ابوطالب تو حضرت حمیدؓ سے درجہ میں بڑھے ہوئے ہیں، عمرؓ و علیؓ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کا مجمع ہے، وہ رفع یدین

نہیں کرتے تھے اور تمام صحابہ اس پر خاموش ہیں، کسی نے نکیر بھی نہیں کی، پس صحابہ کرام کا اس عمل پر رہنا اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ شروع نماز کے علاوہ میں رفع یدین نہیں کرنا چاہیئے۔

حضرت وائل بن حجرؓ اور مالک بن حویرثؓ کی روایات میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے، لیکن اُن روایات کو جمع کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہر تکبیر کے وقت، ہر اٹھنے اور جھکنے کے وقت اور دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کرنا چاہیئے۔ (ترمذی محقق: احمد شاکر: 2/42) لیکن آنجناب اِسے نہیں کرتے، صرف رکوع اور سجدہ میں جاتے وقت ہی کیوں؟ اگر آپ رفع یدین ہی کرنا چاہتے ہیں تو رفع یدین کی تمام صحیح روایتوں کو جمع کرنے کے بعد ہر اٹھنے اور ہر جھکنے اور ہر تکبیر کے وقت بھی رفع یدین کریں۔

اور بھی اِس کے علاوہ کچھ روایتیں ہیں، لیکن کسی میں سند کے اعتبار سے کمزوری ہے اور کسی میں متن کے لحاظ سے۔

اب ذرا رفع یدین نہ کرنے کی احادیث ملاحظہ کریں۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ: کیا میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز کا مسنون طریقہ نہ بتادوں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی اور صرف نماز کے شروع میں ہی ہاتھ اٹھایا۔ترمذی(257) شیخ البانیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح ہے۔

اب ذرا امام ترمذی کا تجزیہ دیکھیئے، اس حدیث کے بعد وہ لکھتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث حسن ہے اور حضرات صحابہ اور تابعین میں سے اہلِ علم حضرات کا یہی مسلک ہے۔

لیجئے جناب! حضرات صحابہ اور تابعین میں سے جب اہلِ علم کا یہی مسلک ہے تو کیا اِس پر عمل کرنا گمراہی ہے؟ یا اہلِ علم صحابہ ہی غلط عمل کر رہے تھے اور آپ

اُن سے زیادہ علم والے ہیں؟

رفع یدین نہ کرنے کی بہت سی احادیث ہیں، جن کو میں اختصار کی وجہ سے چھوڑ دے رہا ہوں، اُن احادیث و روایات کی روشنی میں ائمہ سلف کا جو عمل منقول ہے، اُسے اور ان کے فیصلے و تجزیے آپ کے سپرد کرتا ہوں، آپ خود ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

نامور محدث علامہ نیمویؒ نے اپنی مکمل تحقیق کے بعد یہ نتیجہ بیان کیا ہے:

حضرات خلفاء راشدین سے ابتداءِ نماز کے علاوہ میں رفع یدین کرنا ثابت نہیں۔آثار السنن (1/109)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد انسانیت کی بزرگ ترین ہستیاں یہی خلفاء راشدین ہیں، اِن حضرات کا رفع یدین نہ کرنا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ نبی ﷺ کی آخری سنت یہی ہے، اور نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ: میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنتوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔لیکن کیا کیا جائے کہ کچھ لوگ تو اب خلفاء راشدین کا احترام ہی چھوڑ بیٹھے ہیں تو وہ ان کی سنتوں پر عمل کر کے کریں گے ہی کیا؟

امام دار الہجر ۃ مالک بن انسؒ مدینہ کے امام، جن کے سامنے حضرات صحابہ و تابعین کے عمل کا ذخیرہ موجود تھا، ان کے نزدیک کسی بھی مسئلہ کے راجح ہونے کے لئے اتنی سی بات کافی تھی کہ: مدینہ والوں کا عمل اس پر ہے۔ان کے مشہور شاگرد علامہ ابن قاسمؒ رفع یدین کے سلسلہ میں امام مالکؒ کا تجزیہ نقل کرتے ہیں: امام مالک فرماتے ہیں: میں نماز کے شروع کے علاوہ کسی تکبیر یا اٹھنے یا جھکنے کے وقت رفع یدین کو نہیں جانتا۔المدونۃ الکبریٰ (1/71)

علامہ شوکانیؒ بھی اس حقیقت کا اعتراف کررہے ہیں کہ: علامہ عراقیؒ نے

پچاس صحابہ، جن میں سے عشرۂ مبشرہ بھی ہیں؛ سے جو رفع یدین نقل کیا ہے، وہ نماز کے شروع میں رفع یدین کرنا ہے۔نیل الاوطار (2/191)

دراصل سچی بات یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ سے رفع یدین کرنا اور نہ کرنا دونوں ثابت ہے، اسی طرح صحابہ و تابعین کا قول و عمل بھی دونوں طرح کا ہے، یہ اختلاف صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ (بہتر اور غیر بہتر) کا ہے، نہ تو یہ ''اہلِ سنت والجماعت'' ہونے کی پہچان ہے، نہ ہی ''حق و باطل'' کا معیار۔لیکن اِس کو جس طرح اُچھال کر موضوع بحث بنایا جاتا ہے اور خود سے اختلاف رکھنے والوں کو جس طرح نشانہ بنایا جاتا ہے، وہ اسلامی تعلیمات کے مکمل خلاف ہے، بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سے اسلام پر اعتراض کے راستے کھل رہے ہیں، لیکن کچھ لوگ ہیں کہ خود کو صحیح اور حق پر ثابت کرنے کی کوشش میں پوری دنیا کے مسلمانوں اور ائمہ سلف کو صرف اپنے موقف سے اختلاف رکھنے کی وجہ سے گمراہ قرار دے رہے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا اور جان بھی لیا کہ احادیث سے رفع یدین کرنا اور نہ کرنا دونوں ثابت ہے، اب میں آپ کو وہ چند وجوہ بتادوں کہ رفع یدین نہ کرنا اولیٰ (بہتر) کیوں ہے۔

(1) شروع اسلام میں نماز کے دوران گفتگو کرنا درست تھا، لیکن رفتہ رفتہ نماز میں خشوع و خضوع کا حکم دیا جاتا رہا، چنانچہ نبی ﷺ نے حکم فرمایا: اسکنوا فی الصلوٰۃ۔نماز میں سکون اختیار کرو۔بار بار ہاتھ اٹھانے سے نماز میں سکون رہے گی یا حرکت؟ ظاہر ہے ہاتھ اٹھانا سکون کے منافی (خلاف) ہے، اس لئے بہتر ہے کہ ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔

(2) خلفاء راشدین حضرت عمرؓ و علیؓ اور اہلِ علم صحابہ کا مسلک یہی ہے کہ رفع یدین نہ کیا جائے۔

(3) حضرات صحابہ کے درمیان بھی یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا کہ بعض لوگوں نے رفع یدین کیا اور بعضوں نے نہیں، آپ نے دیکھا کہ ابن عمرؓ سے رفع یدین کی روایت منقول ہے لیکن پھر بھی اُن کا عمل یہ تھا کہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، یعنی وہ مسئلہ کی صحیح صورتِ حال اور اس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور جہاں تک نبی ﷺ کے آخری عمل ہونے کی بات ہے تو اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا آخری عمل رفع یدین کرنا تھا، ایک روایت میں آپؐ کا یہ آخری عمل ثابت کیا گیا ہے، لیکن وہ حد درجہ ضعیف ہے (التعلیقات السّلفیہ: ص104)

لیکن .... ایسے بہت سے قرینے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ کا آخری عمل رفع یدین نہ کرنا تھا، جیسے یہ کہ نماز میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی مثلاً گفتگو سے منع کیا گیا، سکون کا حکم دیا گیا وغیرہ۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کا آخری عمل ہاتھوں کو نہ اٹھانا تھا، کیونکہ یہی سکون واطمینان کے زیادہ لائق ہے۔

اب آپ خود دیکھ لیں کہ دونوں مسلک میں سے راجح اور مضبوط مسلک کون سا ہے؟ اہلِ علم صحابہ وتابعین کا عمل کس پر تھا؟ اور آپ کو کس پر عمل کرنا چاہئے؟

آمین بالجہر (بلند آواز سے آمین کہنا)

جب نمازی سورۂ فاتحہ کی تلاوت پوری کرلے تو اسے ''آمین'' کہنا چاہئے، یہ سنت ہے۔ خواہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہو یا امام کے پیچھے یا خود امام ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جہری (زور سے قرأت کی جانے والی) نمازوں میں امام اور مقتدی کو بلند آواز سے ''آمین'' کہنا چاہئے یا آہستہ اور پوشیدہ طور پر؟

امام مالکؒ وامام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام ومقتدی دونوں کو آہستہ آواز سے آمین کہنا چاہئے، البتہ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ: امام بلند آواز سے آمین کہے اور مقتدی آہستہ سے۔ لیکن بعض لوگوں نے امام ومقتدی دونوں کے لئے بلند آواز سے آمین کہنا ضروری قرار دیا ہے، طرہ یہ ہے کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُنھیں گمراہ اور سنت کے خلاف عمل کرنے والا کہہ دیا جاتا ہے۔

کتب ستہ (جن کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے) میں یہ حدیث ہے کہ: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوجائے گا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردئے جائیں گے۔

لیکن کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ زور اور بلند آواز سے آمین کہی جائے، اور جن روایات میں بلند آواز سے آمین کا ذکر ہے وہ صحیح کے درجہ تک نہیں پہونچی ہوئی ہیں۔

مثلاً حضرت وائل بن حجر کی روایت ہے کہ: نبی ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو کھینچا۔ دار قطنی (1271) یہ حضرت سفیان ثوریؒ کے واسطہ سے مروی ہے، لیکن ان کے ساتھی حضرت شعبہؒ اسی روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں: نبی ﷺ نے آہستہ سے آمین کہی۔ مسند طیالسی (1117)

حضرت ابن عمرؓ سے بھی جہر (بلند آواز) کی روایت منقول ہے لیکن اس کے ایک راوی ''بحر السقاءؒ'' ضعیف ہیں۔دار قطنی میں ہی حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہی منقول ہے،اس روایت کی سند میں ''یحییٰ بن عثمان''اوران کے استاذ''اسحاق بن ابراہیم الزبیدی'' ٹھوس اور مضبوط راوی نہیں ہیں۔ابن ماجہ میں حضرت علیؓ کی روایت ہے اس میں ''ابن لیلیٰ''ضعیف ہیں۔ایک روایت حضرت ام حصین رضی اللہ عنہا سے بھی منقول ہے جس کے ایک راوی ''اسماعیل بن مسلم مکی'' کونسائیؒ اور اصحاب حدیث نے ضعیف کہا ہے۔

خلاصہ کے طور پر اتنا سمجھ لیں کہ: وہ تمام حدیثیں جس کے اندر بلند آواز سے آمین کہنے کا ذکر ہے،وہ سب کی سب ضعیف ہیں،کوئی ایک بھی ایسی صریح اور صحیح روایت موجود نہیں جس سے واضح طور پر بلند آواز سے آمین کہنے کا ثبوت ملتا ہو۔

اب ذراوہ روایات ملاحظہ کریں جن میں آہستہ آواز سے آمین کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات جاننی چاہئے کہ''آمین''اصل میں دعاء ہے،جس کا مطلب ہے''اے اللہ!اِسے قبول فرمالیجئے۔''علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری (2/263) میں علامہ ابن منیرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: آمین دعاء ہے۔

اور......دعاء کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے:**أدعُوا ربَّكُم تضرُّعاً وّخُفيَةً.** الاعراف (55) اللہ سے دعاء کروگڑگڑا کر اور آہستہ سے۔یعنی اللہ تعالی نے دعاء میں پوشیدگی اور آہستگی کا حکم دیا،لہٰذا آہستہ آواز سے آمین کہنی چاہئے۔

اوراگر آمین دعاء نہیں بلکہ ذکر ہے تو''الاعراف'' کی ہی آیت (205) ہے: **واذكر ربك في نفسك تضرعا وخيفة.** اللہ کا ذکر کرواپنے دل میں پوشیدہ طور پر۔یعنی بہرصورت خواہ آمین کو دعاء مانی جائے یا ذکر قرار دیا جائے،اللہ

کا فرمان کہہ رہا کہ اسے آہستہ آواز سے کہا جائے۔

حضرت وائل بن حجرؓ والی حدیث جو حضرت شعبہؒ کے طریق سے مروی ہے۔اس میں ہے کہ: نبی ﷺ نے آہستہ سے آمین کہی۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: نبی ﷺ ہمیں تعلیم دیتے تھے......جب امام ''**ولا الضالين**'' کہے تو تم ''آمین'' کہو،اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو،جب وہ''**سمع الله لمن حمده**'' کہے تو تم''**اللهم ربنا ولك الحمد**'' کہو۔مسلم (959)

اس روایت میں غور کریں کہ: جب امام''**سمع الله**'' کہے تو تم''**اللهم ربنا**'' کہو،ظاہر ہے کہ ''**اللهم ربنا ولك الحمد**''آہستہ آواز میں کہی جاتی ہے،بالکل اِسی انداز میں کہا گیا ہے کہ: جب امام ''**ولا الضالين**'' کہے تو تم ''آمین'' کہو۔حدیث اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ جس طرح''**اللهم ربنا ولك الحمد**'' آہستہ آواز میں کہی جاتی ہے،یقینی طور پر''آمین'' بھی اسی طرح کہی جائے گی۔

حضرت ابووائل فرماتے ہیں کہ: **حضرت عليؓ و ابن مسعودؓ رضي الله عنهما اعوذ بالله،بسم الله** اور آمین کو آہستہ آواز سے کہتے تھے۔طبرانی (9202)

علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں حضرت علیؓ وعمرؓ کا یہی معمول بیان کیا کہ دونوں آہستہ آواز میں آمین کہا کرتے تھے۔

ان تمام روایات وآثار سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ: قرآنی تعلیمات کی رُو سے آمین آہستہ کہنی چاہئے۔جس طرح''**اللهم ربنا لك الحمد**'' آہستہ آواز سے کہا جاتا ہے،اسی طرح آمین بھی کہی جائے۔قرآن کی

کسی ایک آیت یا احادیث میں سے کسی بھی ایک صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زور اور بلند آواز سے آمین کہی جائے۔

البتہ بعض روایات سے اونچی آواز میں آمین کہنے کا ثبوت ملتا ہے، لیکن...وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔ اگر انھیں صحیح کے دائرے میں رکھ بھی لیا جائے تو اس سے ہمیشگی ثابت نہیں ہوتی۔ حدیث کا علم رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ نبی ﷺ سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ فرماتے یعنی خاموش ہو جاتے، کبھی کبھی بلند آواز سے اس لئے آمین کہہ دیتے تھے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اِس سکتہ میں آمین کہی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری بہت سی روایات میں ہے کہ نبی ﷺ ظہر وعصر کی نماز میں ایک آدھ آیت بلند آواز سے پڑھتے تھے تاکہ آنے والے حضرات کو معلوم ہو جائے کہ قرأت ہو رہی ہے، اسی طرح مسلم شریف کی حدیث ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ''سبحانک اللھم'' بلند آواز سے پڑھی۔ اب اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ ظہر وعصر میں بلند آواز سے قرآت کی جائے یا سبحانک اللھم کو زور سے پڑھا جائے۔ اِسی طرح کبھی اگر نبی ﷺ نے بلند آواز سے آمین کہی ہے تو اس سے یہ بات کیسے ثابت ہو سکتی ہے کہ ہمیشہ آمین کو بلند آواز سے ہی پڑھا جائے؟

اگر اونچی آواز سے آمین کہنا نبی ﷺ کا معمول ہوتا تو آپ ذرا غور کریں کہ صحابۂ کرام جیسے شیدائی جنھوں نے نبی ﷺ کی انگلیوں کی حرکت تک کو محفوظ کر کے رکھا، کیا وہ نبی ﷺ کے اِس عظیم معمول کو نقل نہ کرتے؟ اسی لئے علامہ نیمویؒ کہہ اٹھے کہ: بلند آواز سے آمین کہنا نہ تو نبی ﷺ سے ثابت ہے نہ ہی چاروں خلفاء سے، اور جو روایت اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے وہ جرح وتنقید سے خالی نہیں۔ آثار السنن (1/94)

کوئی بھی ایسی صریح اور صحیح روایت نہیں جس سے بلند آواز سے آمین کہنے کا

دائمی اور ہمیشگی کے ساتھ معمول ہونا ثابت ہوتا ہو، پھر نبی علیہ السلام نے تو فرمایا: لوگو! میانہ روی سے کام لو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، جس کو تم پکارتے ہو وہ ہر بات کو سننے والا ہے اور نزدیک ہے۔ بخاری (2992) یہ تو آہستہ آمین کہنے کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے جو لوگ آہستہ سے آمین کہیں گے وہی متبعِ سنت ہوں گے۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھا جائے؟

قیام (نماز کے اندر کھڑے ہونے) کی حالت میں ہاتھ کہاں پر باندھا جائے؟ اس سلسلہ میں حضرت امام دار الہجرۃ مالکؒ کا مسلک ہے: مستحب یہ ہے کہ ہاتھ کو باندھا ہی نہ جائے بلکہ چھوڑ دیا جائے، لیکن اگر نفل نماز میں سینہ پر باندھا جائے تو حرج نہیں، لیکن فرض نماز میں مکروہ ہے۔ بلغۃ السالک (1/11) حضرت امام شافعیؒ کا موقف یہ ہے کہ: سینہ کے نیچے ناف کے اوپر باندھ جائے۔ المجموع (3/310) حضرت امام اہل السنہ احمد بن حنبلؒ سے تین طرح کی روایتیں منقول ہیں: ناف کے نیچے۔ ناف سے اوپر۔ اور دونوں جگہ کی گنجائش ہے۔ (شرح المغنی) احناف کے یہاں بہتر یہ ہے کہ ہاتھوں کو ناف سے نیچے اس طرح باندھا جائے کہ نچلا ہاتھ ناف سے نیچے اور اوپر والا ہاتھ ناف کے اوپر ہو۔

اِن چاروں مذاہب کے درمیان کوئی شدید قسم کا اختلاف نہیں ہے، البتہ چاروں اماموں میں سے کسی ایک امام کے نزدیک بھی سینہ پر ہاتھ باندھنا مستحب نہیں ہے، مالکیّہ کے یہاں صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس مسئلہ پر بھی واویلا مچا رکھا ہے کہ سینے پر ہی ہاتھ باندھنا سنت ہے، ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا صحیح نہیں۔ جب کہ معاملہ صرف اس قدر ہے کہ روایات دونوں طرح کی

ہیں لیکن ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات زیادہ مضبوط ،واضح اور ثابت ہیں۔

ذراوہ روایات ملاحظہ کریں جن میں سینے پر ہاتھ باندھنے کی بات آئی ہے:

حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبیﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ،آپؐ نے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر سینے کے اوپر رکھا تھا۔صحیح ابن خزیمہ (479) شیخ البانیؒ فرماتے ہیں :اس کی سند ضعیف ہے۔اس میں ایک راوی ''مؤمل بن اسماعیل'' ہیں جن کو امام بخاریؒ نے منکر الحدیث کہا ہے۔(سیر اعلام النبلاء)۔

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ: یہ وہ ''مؤمل'' نہیں ہیں جن پر امام بخاریؒ نے نقد کیا ہے، بلکہ یہ دوسرے مؤمل ہیں۔تو جاننا چاہئے کہ اگر یہ وہی ''مؤمل بن اسماعیل العدوی'' نہیں ہیں بلکہ دوسرے یعنی ''**مؤمل بن اسماعیل القرشی العدوی**'' ہیں تو انھیں ابن حجرؒ نے ''سیئ الحفظ'' کہا ہے،حضرت ابوحاتم نے ان کے بارے میں فرمایا: بہت زیادہ غلطیاں کرتے تھے۔(رواۃ التہذیبین) یعنی اصحابِ حدیث میں صرف دو لوگ ہی ''مؤمل بن اسماعیل'' کے نام سے ہیں،دونوں ضعیف ہیں۔اب آپ جس ''مؤمل'' کو چاہیں مُراد لے لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت وائل بن حجرؓ سے یہی روایت مصنف ابن ابی شیبہ(3959) میں اس طرح ہے: نبیﷺ نے ناف کے نیچے ہاتھ باندھا تھا۔

مسند احمد(22017) میں حضرت ہلب طائی کی روایت ہے کہ: نبیﷺ نے سینے پر ہاتھ باندھا۔علامہ شعیب الارنؤوط اس حدیث کے بابت فرماتے ہیں کہ:اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی ''قبیصہ ابن ہلب'' مجہول ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ایک راوی سماک بن حرب ہیں جن کے بارے

میں امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ: جب یہ تفرد اختیار کریں (یعنی اپنے ساتھیوں کے خلاف حدیث بیان کریں) تو یہ حجت نہیں۔نیز اس روایت میں حضرت سفیان ثوریؒ بھی ہیں جن کا عمل اِس کے خلاف ہے۔اگر یہ روایت عمل کے لائق ہوتی تو اس کو روایت کرنے والے لوگ خود بھی اس پر عمل کرتے۔

تیسری مرسل روایت حضرت طاؤسؒ کی ہے کہ نبیﷺ ہاتھوں کو سینہ پر باندھتے تھے۔(مراسیل ابوداؤد) اس میں ایک راوی سلیمان بن موسیٰ ہیں جن کا حافظہ خراب ہوگیا تھا،جس کی وجہ سے ان کی حدیثیں صحیح نہ رہ سکی۔

اِن کے علاوہ کوئی اور ایسی حدیث نہیں ہے جن کی وجہ سے ''کوئی شخص'' یہ کہہ سکے کہ سینہ پر ہی ہاتھ باندھنا سنت ہے۔اور اگر روایتیں ہیں تو حد درجہ ضعیف جو خود اُن ہی لوگوں کے یہاں معتبر نہیں۔

جب آپ نے سینہ پر ہاتھ باندھنے کی تمام روایتیں دیکھ لی اور اِس نتیجہ پر پہونچ چکے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کو سنت قرار دینا درست نہیں ہے تو اب وہ روایتیں ملاحظہ کریں جن میں ''ناف کے نیچے'' ہاتھ باندھنے کے بابت ارشاد ہوا ہے:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: نبیﷺ کی سنت یہ ہے کہ نماز میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھ کر باندھا جائے۔ابوداؤد(756) (یہ حدیث ضعیف ہے،لیکن حد درجہ کی ضعیف نہیں)

حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبیﷺ کو نماز میں دیکھا کہ آپ نے ناف کے نیچے ہاتھ باندھ رکھا تھا۔مصنف ابن ابی شیبہ(3959)

حضرت جریر بن ضبیؒ اپنے والدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ: میں نے حضرت علیؓ کو نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھے ہوئے دیکھا۔ابوداؤد(757) یہ حدیث بھی مضبوط نہیں ہے۔

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی بھی کوئی مرفوع روایت (جو نبی ﷺ سے ثابت ہو) بالکل صحیح سند کے ساتھ منقول نہیں ہے، جیسا کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایات صریح اور صحیح نہیں ہیں۔

البتہ حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت ابومجلزؒ اور سب سے بڑھ کر حضرت علیؓ کا فرمان اس پر شاہد ہے کہ ناف کے نیچے ہی ہاتھ باندھا جائے۔ جب کوئی صحابی کسی چیز کے بارے میں یہ کہے کہ ''یہ سنت ہے'' تو وہ ایسی ہی ہوجاتی ہے جیسے نبی ﷺ سے ثابت ہو، کیونکہ کسی صحابی میں یہ جرأت نہیں کہ وہ نبی ﷺ کی طرف کسی چیز کے بارے میں غلط نسبت کریں۔ چنانچہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو حضرت علیؓ نے ''سنت'' کہا، جس سے صاف طور پر یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی نبی ﷺ کا طریقہ تھا۔

پھر ذرا آگے بڑھ کر عقلی اور فطری اعتبار سے سوچیں بھی تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جب کسی کی بہت زیادہ تعظیم اور ادب مقصود ہوتا ہے تو انسان ناف کے نیچے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے، کیونکہ سینہ پر ہاتھ باندھنا تعظیم کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ پھر ذرا یہ بھی تصور کریں کہ: جو لوگ قیام کی حالت میں پاؤں کو بالکل پھیلا کر (Wide) اور ہاتھوں کو سینے کے اوپر باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، کیا اس میں تعظیم وعزت کا پہلو بھی ہے، طبعی اور فطری طور پر بھی سینہ پر ہاتھ باندھے ہوئے پاؤں کو پھیلا کر کھڑے ہونا سکون واطمینان اور تواضع وادب کی حالت نہیں کہی جاسکتی، جب کہ نماز تو حد درجہ سکون وتواضع اور اللہ عزوجل کے ادب کی تلقین کرتا ہے، اس لئے کہ دین اسلام مکمل دینِ فطرت ہے، اور تعظیم کے لئے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ہی عین فطرت ہے۔

کیا امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنا ضروری ہے؟

نماز خواہ سری (آہستہ قرأت کی جانے والی) ہو یا جہری (بلند آواز سے قرأت کی جانے والی) حضرات احناف کے یہاں بہرصورت امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ امام مالکؒ کے یہاں سری نماز میں مستحب اور جہری میں مکروہ ہے۔ امام شافعیؒ کے یہاں سری نماز ہو یا جہری، مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اگر مقتدی امام کی قرأت سن رہا ہو تو اس کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا درست نہیں اور اگر اُس تک امام کے قرأت کی آواز نہیں پہونچ رہی ہو یا نماز سری ہو تو مستحب ہے، یا جہری نماز میں امام کے سکتہ کے درمیان سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

آج کل کچھ لوگوں نے اپنا مسلک یہ بنایا ہے کہ باجماعت نماز (سری وجہری) میں تمام مقتدیوں کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز درست نہیں ہوتی۔

اِس سلسلہ میں دلیلیں دو قسم کی ہیں۔ پہلی وہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے، دوسری وہ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے مقتدی کو خاموش رہنا چاہئے۔ سب سے پہلے وہ دلائل دیکھئے جن سے مقتدی کے لئے قرأت کی گنجائش نکالی جاتی ہے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ: ایک بار نبی ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی جس میں آپؐ کے لئے قرأت کرنا دشوار ہوگیا، نماز کے بعد آپ ﷺ نے دریافت کیا: میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں! ہم پڑھتے ہیں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کرو، ہاں! سورۂ فاتحہ مستثنیٰ (Exception) ہے، کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ترمذی (311)

شیخ البانیؒ کہتے ہیں کہ: یہ روایت ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہیں جن کے بارے میں میزان الاعتدال (3/469) میں لکھا ہے: یحییٰ بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ ابن اسحاق جھوٹا ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں: وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔ سلیمان تیمیؒ کہتے ہیں: جھوٹا ہے۔ دارقطنیؒ فرماتے ہیں: اس کی بات اِس لائق نہیں کہ اسے دلیل بنائی جائے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ: اس حدیث کو ائمۂ حدیث نے مختلف وجوہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ (23/286)

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: یہ حدیث حسن ہے، مگر یہ حدیث دوسری صحیح سند (جو نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے) سے اس طرح مروی ہے کہ: جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

آئیں اب ذرا اِس حدیث کا صحیح محمل اور مصداق تلاش کریں، یہ جو کہا گیا ہے کہ ''جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی'' یہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو تنہا اپنی نماز پڑھتے ہیں، کیونکہ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: جس شخص نے کوئی ایسی رکعت پڑھی جس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ (تو اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری نہیں) ترمذی (313) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح اور حسن ہے۔

اب آپ یہ بتائیں کہ آپ حدیث شریف کا مطلب زیادہ اچھی طرح بیان کرسکتے ہیں یا صحابیِ رسول؟ آپ مزاجِ نبوت اور اسلامی تعلیمات کی روح کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں یا وہ صحابہؓ جن کو اللہ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت سنادی؟ صحابیؓ رسولﷺ کہہ رہے ہے کہ: امام کے پیچھے مقتدی قرأت نہ کرے، آپ کہتے ہیں کہ: قرأت

کرے؟ کس کی بات مانی جائے؟ آپ کی یا رسولﷺ کے شیدائی کی؟

جو لوگ مقتدی کے لئے قرأت کو ضروری قرار دیتے ہیں اُن کے پاس دوسری دلیل یہ ہے کہ: جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ بخاری (756)

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب حضرت جابر بن عبداللہؓ نے بیان کردیا کہ: یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو امام کے پیچھے نہ ہوں۔ حضرت امام ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ: حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا: یہ صحابیٔ رسول اس حدیث کا مطلب یہ بتارہے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھ رہے ہوں۔ یعنی منفرد کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب اور ضروری ہے، اس شخص کے لئے نہیں جو امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو۔

ابوداؤد میں بھی حضرت عبادہؓ کی یہ حدیث اس طرح ہے: اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور اس سے زیادہ نہ پڑھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ: یہ اس شخص کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھ رہا ہو۔ (822)

لیکن اگر آپ ..... اِس کو مقتدی ہی کے لئے ماننے پر مُصر ہیں تو پھر مکمل طریقہ پر عمل کریں کہ مقتدی سے سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ اور بھی قرأت کروائیں، کیونکہ دوسری صحیح حدیث میں ''فصاعدا'' ''اور کچھ زیادہ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

حضرت انسؓ سے بھی ایک روایت اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہے جس کے بارے میں علامہ بیہقیؒ (2/166) فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی یہ منقول ہے کہ فاتحہ پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں ایک راوی یحییٰ بن مسلم البکاء ہیں جن کو امام الجرح والتعدیل ابن معینؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ سیر اعلام النبلاء۔

حضرت ابیؓ بن کعب سے بھی اسی معنی کی روایت ہے، جس میں ایک شخص ابو جعفر الرازی ہیں جو امام احمدؒ اور نسائیؒ کے نزدیک قوی نہیں، امام فلاسؒ کہتے ہیں کہ: اس کا حافظہ خراب ہے۔ ابن حبانؒ نے فرمایا: وہ مشہور لوگوں کی طرف منکر روایتیں منسوب کرتا تھا۔

یہ وہ چند دلائل ہیں جسے اچھی طرح نہ سمجھ کر کچھ لوگ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس کے علاوہ بھی جو دلیلیں ہیں، سب کی سب لچر اور کمزور ہیں جن پر صحیح حدیثوں کے ہوتے ہوئے کسی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

جب آپ نے دیکھ لیا کہ ائمۂ عظام نے حدیث کا مطلب کیا بیان کیا ہے؟ تو اب وہ دلیلیں دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو خاموش رہنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اذا قُرِئَ القرآنُ فاستمِعُوا له وأنصتوا.** الاعراف (204) جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموشی اختیار کرو۔

اس آیت میں قرآن کی تلاوت کے وقت سننے والوں کے لئے دو حکم ہیں: ایک تو غور سے سننے کا، اور غور سے سننا اس وقت ہوگا جب بندہ خود کچھ نہ پڑھ رہا ہو، پھر آگے دوسرا حکم صاف ہے کہ: خاموش رہو۔ لہٰذا امام کی قرأت کے وقت سورۂ فاتحہ پڑھنے سے اس آیت کی خلاف ورزی ہوگی۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی وہ حدیث جو ابھی گذری کہ: جو امام کے پیچھے ہو تو وہ سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ: پیغمبرﷺ نے ہمیں خطبہ میں سنت سکھائی...... جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ قرآن پڑھنے لگے تو تم

خاموش رہو، جب وہ **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین** کہے تو تم آمین کہو، اللہ تمہاری دعاء قبول کرے گا۔ (مسلم 932)

اس حدیث میں صاف ہے کہ نماز باجماعت میں قرأت کرنا امام کی ذمہ داری ہے، مقتدی کا کام خاموش رہنا ہے۔ پھر فرمایا گیا کہ: جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صرف امام ہی قرأت کرے گا، کیونکہ اگر سب لوگ قرأت کرتے تو کہا جاتا کہ جب تم ولا الضالین پر پہونچو تو آمین بھی کہہ لو، لیکن کہہ رہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو تم آمین کہو جس سے پتہ چلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کی ذمہ داری ہے، مقتدی کی نہیں۔ اب لگے ہاتھوں ملاحظہ کریں:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ پیغمبرﷺ نے فرمایا: جب قاری (پڑھنے والا) ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ مسلم (960)

یعنی جب امام سورۂ فاتحہ مکمل کرلے تو آپ آمین کہیں، امام کو قاری یعنی قرأت کرنے والا (پڑھنے والا) کہا گیا، آپ کو نہیں، اگر آپ کو بھی قرأت کرنی ہوتی تو پیغمبرﷺ فرماتے: جب تم سورۂ فاتحہ پڑھ چکو تو آمین کہو۔ جس سے اسی بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرأت صرف امام کرے، مقتدی نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے دو طرح کی روایتیں مروی ہیں، ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ ''اپنے دل میں سورۂ فاتحہ پڑھ لو'' اور دوسری روایت میں ہے کہ خاموش رہو۔ امام مسلمؒ نے اِس (خاموش رہنے کی) روایت کو صحیح کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ: اگر کسی ایک شخص سے دو طرح کی روایات منقول ہوں تو اُس روایت پر عمل کیا جاتا ہے جس کی تائید قرآن وحدیث سے ہوتی ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ کی ''خاموش رہنے'' والی روایت کی تائید قرآن واحادیث سے ہورہی ہے، لہٰذا اسی

پر عمل کیا جائے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو، اُس کے لئے امام کی قرأت ہی کافی ہے۔ ابن ماجہ (850)

حضرت عطاءؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے امام کے ساتھ قرأت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: امام کے ساتھ کچھ بھی قرأت نہیں کی جاتی۔ مسلم (1326)

حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا گیا: کیا امام کے پیچھے بھی قرأت کی جائے گی؟ تو آپؓ نے جواب عنایت فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کے لئے امام کی قرأت ہی کافی ہے، لیکن اگر وہ تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے۔ مؤطا امام مالک (192)

اس معنیٰ کی بہت ہی زیادہ روایات ہیں، جن کو میں اختصار کے پیش نظر چھوڑ رہا ہوں، ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت نہیں کرنی چاہئے۔ اب اکابرینِ امت کے وہ فیصلے سنیں جو انھوں نے ہر طرح کی احادیث دیکھنے، پرکھنے اور جانچنے کے بعد کئے ہیں:

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: امام کی قرأت سننے اور خاموش رہنے کا حکم قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد والی سورہ کے بارے میں جمہور صحابۂ کرام اور علماء امت کا یہی مسلک ہے (کہ مقتدی خاموش رہے اور امام قرأت کرے) اور سورۂ فاتحہ کے بعد والی سورہ کی قرأت کے وقت مقتدی کے خاموش رہنے اور غور سے سننے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ مجموع الفتاویٰ (22/341)

علامہ البانیؒ فرماتے ہیں: شروع میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت تھی، پھر نبی ﷺ نے جہری نمازوں میں مقتدی کو ہر قسم کی قرأت سے روک دیا..... اور امام کی قرأت کے وقت مقتدی کی خاموشی کو اقتداء کے لئے لازم بنایا، ارشاد نبوی ﷺ ہوا: امام کا مقصد یہی ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، وہ یوں کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ پڑھنے لگے تو تم خاموش ہو جاؤ۔ صفۃ الصلوٰۃ (99)

خلاصہ یہ کہ: شریعت نے امام اور مقتدی دونوں کی ذمہ داریوں کو بانٹ دیا ہے، جہاں پر مقتدی کو بھی کوئی عمل کرنا تھا، وہاں نبی ﷺ نے وضاحت فرمادی۔ جیسے فرمایا کہ: جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ لیکن نبی ﷺ نے امام کی قرأت کے وقت یہ حکم دیا کہ: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ اور طریقہ بھی یہی ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت ہو تو اسے غور سے سنا جائے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام جب قرآن لے کر آتے اور نبی ﷺ کو سناتے تو نبی ﷺ اِس خوف سے کہیں بھول نہ جاؤں؛ اسے جلدی جلدی پڑھنے لگتے، تو اللہ تعالی نے وحی بھیجی: **لا تحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه.** آپ جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، ہمارے ذمہ اس کو پڑھوانا ہے۔ بخاری شریف کتاب الوحی میں حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کا معنی یہ بتایا ہے کہ: جب قرآن سنایا جائے تو آپ غور سے سنیں، چنانچہ جب جبریلؑ تشریف لاتے تو نبی ﷺ سے اسے غور سے سنتے.... الخ۔

غور کریں کہ جب نماز کے باہر قرآن کی تلاوت ہو تو اللہ کا حکم اور نبی ﷺ کا عمل یہ ہے کہ اسے غور سے سنا جائے، تو نماز کے دوران اس کا اہتمام کس قدر زیادہ

ہونا چاہئے۔ نیز جمہور صحابہؓ کرام کے واضح ارشادات بھی یہی ہیں کہ مقتدی قرأت نہ کرے، مرفوع احادیث اور آثار سب سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے: امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرأت کرے، مقتدی کا کام یہ ہے کہ وہ خاموشی سے امام کی قرأت سنے۔ مجھے امید ہے کہ انصاف پسند طبیعتیں حقیقت کا اندازہ لگا چکی ہوں گی۔

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا

شریعت اسلام سراپا اعتدال کا نام ہے، نہ اس میں افراط (کسی چیز میں بہت زیادتی) کی گنجائش ہے نہ تفریط (بہت زیادہ کمی) کی۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے کچھ لوگوں کی تشدد پسندی نے ضرورت سے زیادہ متنازع فیہ (اختلافی Disputed) بنادیا ہے، کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اس عمل کو لازم قرار دیتے ہیں کہ اس کا چھوڑنا قابلِ مذمت ہے، دوسری جانب کچھ لوگ ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کو بدعت کہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگ اپنے نظریے میں انتہا پسند ہیں۔

جب کہ سیدھا راستہ اور شریعت محمدیہ کا طریقہ یہ ہے کہ: فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا پسندیدہ، مسنون، مستحسن اور امت کے عملی تواتر (امت یہ کام کرتی چلی آرہی ہے) کے پیشِ نظر ایک اچھا عمل ہے۔ اسے بدعت قرار دینا بذاتِ خود ایک غیر محتاط رویہ اور بدعت ہے، دوسری جانب جو لوگ اِسے لازم قرار دے رہے ہیں اُن کا بھی خدمتِ دین اور اتباعِ سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم دونوں سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے اور اللہ سے درستگی اور حق کی توفیق مانگتے ہوئے آپ کے سامنے سب سے پہلے وہ روایتیں پیش کرتے ہیں جن میں ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا ثابت ہے، پھر وہ روایتیں جن میں نماز کے بعد دعاء کرنے کا ذکر ہے۔

حضرت سلمانؓ نبی ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ: تمہارا رب بہت حیادار اور

کریم ہے، جب بندہ اس کے سامنے دستِ سوال اٹھاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اُن کو خالی اور ناکام لوٹا دے۔ ابو داؤد (1490) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر کی جانے والی دعاء رد (ٹھکرائی نہیں جاتی) نہیں ہوتی، لیکن اِسے نماز کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا۔ اب ذرا آگے بڑھیں:

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ جب دعاء کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تو اس وقت تک ہاتھ نہیں نیچے کرتے جب تک اُن کو چہروں پر پھیر نہیں لیتے۔ ترمذی (3386)

اس طرح کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگتے تھے، جیسا کہ علامۃ الفہامہ ابن حجر عسقلانیؒ بھی اس کے معترف ہیں، علامہ سیوطیؒ نے ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کے سلسلہ میں ایک رسالہ ''فض الوعاء'' کے نام سے تصنیف کیا ہے جس میں انھوں نے ساٹھ کے قریب احادیث وآثار نقل کئے ہیں جن سب میں ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا ذکر ہے۔ اب وہ روایتیں ملاحظہ کریں جن میں نماز کے بعد دعاء کرنے کا بیان ہے:

حضرت محمد بن ابو یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابن زبیرؓ کو دیکھا کہ انھوں نے ایک شخص کو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگتے ہوئے دیکھا تو آپؓ نے فرمایا: نبی ﷺ اس وقت تک ہاتھ اٹھا کر دعاء نہیں کرتے تھے جب تک نماز پوری نہ کر لیتے۔ طبرانی (90) علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ہے۔

اس حدیث میں صاف ہے کہ نبی ﷺ نماز پوری کرنے سے پہلے دعاء کے

لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے، بلکہ نماز پوری کرنے کے بعد ہاتھ اٹھاتے تھے۔اگر آپ اب بھی تردد میں ہیں تو لیجئے حضرت فضل بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:.....تم خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھو، پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے اللہ کی طرف اٹھاؤ اس طرح کہ ہتھیلی والا حصہ چہرے کی طرف ہو۔ترمذی (385)

روایت کے الفاظ دیکھئے کہ نماز خشوع وخضوع سے پڑھو پھر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرو۔اب تو آپ کو یقین ہو چلا ہوگا کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا مسنون ہے۔لیکن...اگر اب بھی کوئی شخص کٹ حجتی کرے کہ روایت میں فرض نماز کا ذکر نہیں ہے تو مجھے اس کی سمجھ پر افسوس ہے، کیونکہ کسی نیک عمل کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا اچھا عمل ہے، جب غیر فرض (نفل) نمازوں میں ہاتھ اٹھا سکتے ہیں تو جو نفل سے افضل ہے، جو زیادہ اہم ہے یعنی فرض، اس میں کیوں نہیں اٹھا سکتے ؟ کیا اس کے پاس ایک بھی ضعیف سے ضعیف تر روایت ہے جس میں نبی ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہو؟ نہیں ہے۔تو پھر یہاں جب حدیثیں موجود ہیں جو ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے پر دلالت کر رہی ہیں تو اِسے صحیح اور مسنون مان لینے میں کون سی چیز رکاوٹ بن رہی ہے؟

اب اس کا آخری حربہ یہ ہوگا کہ اس روایت میں ''عبداللہ بن نافع بن العمیاء'' کو علامہ ابن حجرؒ نے ''تقریب'' میں مجہول قرار دیا ہے، تو ضروری نہیں کہ اگر ابن حجر رحمہ اللہ کے علم میں وہ مجہول ہیں تو ہر ایک محدث کے نزدیک مجہول ہوں، امام ابن حبانؒ کے نزدیک ان کا شمار ثقات (معتمد علیہ،ٹھوس) میں سے ہے۔(رواۃ التہذیبین) امام نسائیؒ جیسے سخت ناقد نے بھی انھیں ثقہ کہا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: جو بندہ ہر نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر یہ دعاء کرتا ہے:''اے میرے خدا! ابراہیمؑ و اسحاقؑ اور

یعقوبؑ، جبرئیلؑ و اسرافیلؑ اور میکائیلؑ کا رب! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ میری دعاء قبول فرما، کیونکہ میں مجبور و پریشان ہوں، میری حفاظت فرما کہ میں دینِ حق میں کسی پریشانی میں نہ ڈالا جاؤں، مجھے اپنی رحمت سے نواز دے کہ میں گنہ گار ہوں، مجھ سے فقر و تنگدستی کو دور فرما دیں کہ میں مسکنت کا شکار ہوں'' تو اللہ تعالی اس کے دونوں ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹائے گا. عمل الیوم و اللیلة للنسائی (137)

اس حدیث میں ایک راوی ''عبدالعزیز بن عبد الرحمٰن'' کو ضعیف کہا گیا ہے، لیکن یہ روایت معنوی طور پر بذاتِ خود اور دوسری روایتوں سے مل کر قابلِ استدلال بن جاتی ہے۔اور خاص کر جب کہ آپ اِسے بغیر دلیل کے بدعت قرار دے رہے ہیں تو آپ کے مفروضات اور قیاس آرائیوں سے تو یہ لاکھ گنا بہتر ہے۔

حضرت معاذؓ کی وہ حدیث بہت زیادہ مشہور ہے کہ انھیں نبی ﷺ نے فرمایا: معاذ! میں تم سے محبت کرتا ہوں! تم ہر نماز کے بعد یہ دعاء مانگ لیا کرو: اللھم أعنی علی ذکرک و شکرک وحسن عبادتک. الٰہی! تو اپنے ذکر، شکر اور اپنی بہترین عبادتوں میں میری مدد و معاونت فرما۔ابوداؤد (1524) یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی ہے۔

ایک طرف نماز کے بعد دعاء کا حکم، دوسری جانب ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کی فضلیت۔تو کیوں نہ دونوں کو جمع کر کے قبولیت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے کہ نماز کے بعد دعاء بھی مانگی جائے اور ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے تا کہ دعاء کو زیادہ سے زیادہ قبولیت کا مرتبہ مل سکے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امت کے صلحاء و علماء کرام کا عمل جو مسلسل چلا آ رہا ہے کہ وہ لوگ نماز کے بعد اٹھا کر دعاء مانگتے تھے اور مانگتے ہیں۔ایک طرف اتنی ساری روایتیں، گرچہ بعض ضعیف بھی ہیں، دوسری جانب امت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے ''تلقی بالقبول'' کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوا ہے، تا آنکہ علامہ

نوویؒ نے مسلم کی شرح میں بہت سی جگہوں پر ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کے سلسلہ میں لکھا ہے اور اپنی کتاب ''المجموع'' میں اس سلسلہ میں تیس روایتیں ذکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا ہے کہ: یہ مستحب ہے۔(3/507) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری کی گیارہویں جلد میں اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس سلسلہ میں بہت سی احادیث ہیں۔(118-121) لگے ہاتھوں لیجئے ذرا شیخ محمد بن اسماعیل الامیر الیمنی الصنعانیؒ کی رائے بھی دیکھ لیں، وہ ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے والی روایت کے بعد لکھتے ہیں کہ: اس میں دعاء کے وقت ہاتھ اٹھانے کے لئے دلیل شرعی موجود ہے۔سبل السلام (2/517)

اس لئے اس میں کسی ادنیٰ شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ: نماز (فرض و نفل) کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا بہتر، مستحب، مستحسن اور اچھا عمل ہے، اور تعصب کی وجہ سے اسے بدعت کہنا یا افراط میں مبتلا ہو کر اسے لازم قرار دینا گمراہی اور بدعت ہے۔

ننگے سر نماز پڑھنا

انسان کی عام عادت یہ ہے کہ وہ ہر وقت زینت اختیار کئے رہتا ہے، اچھے سے اچھے لباس میں ہونا چاہتا ہے۔فرض کریں: آپ کو کسی مجسٹریٹ یا منسٹر نے بلایا ہو، آپ اس سے ملنے جا رہے ہوں تو کس طرح کے لباس میں جائیں گے؟ ظاہر ہے جو اُس سماج و معاشرہ اور اُس بلانے والے کے نزدیک سب سے بہترین کپڑا ہوگا۔

اب بھلا بتائیں کہ اگر بادشاہوں کا بادشاہ، دلوں کا مالک اور عظیم کائنات کی ہر ہر چیز جس کے قبضہ میں ہے، وہ اگر آپ کو اپنے دربار میں بلائے تو کیا آپ یونہی کھڑے ہو کر چل دیں گے؟ یا آپ اس کی شریعت کا لباس پہن کر اور پوری سج دھج اختیار کر کے اس کے پاس جائیں گے؟

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے.....سوال یہ ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو جاننا چاہیئے کہ ضروری حد نماز کے لئے صرف اس قدر ہے کہ انسان کا ستر (پوشیدہ حصہ، ناف سے گھٹنے تک) چھپا ہوا ہو، اس سے زیادہ فرض نہیں۔لیکن بات تہذیب کی ہے کہ آپ کس کے دربار میں جا رہے ہیں؟ اس کے دربار کے آداب کیا ہیں؟

ننگے سر نماز پڑھنا بہتر نہیں، اور اس طرح نماز میں عادت بنا لینا خطرناک ہے، یہ شریعت اور نماز کا گویا مذاق ہے، اگر مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن جان بوجھ کر بہتر نہیں ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اِس پر آشوب دور میں کچھ لوگ یہ علم لے کر کھڑے ہوئے ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، ایسی کوئی حدیث نہیں جس میں نبی ﷺ نے ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو، غضب یہ ہے کہ یہ

لوگ کچھ اس طرح بے باک ہو چکے ہیں کہ اگر ٹوپی پہن رکھی ہوتی ہے تو نماز پڑھنے کے لئے ٹوپی اتار لیتے ہیں۔فالی اللّٰہ المشتکی!

آئیں ذرا اسلامی تعلیمات کے آئینہ میں اِن کا چہرہ دیکھیں !

نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ٹوپی اور عمامہ میں نماز پڑھتے تھے یعنی سر کو ڈھک کر، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے: **صلوا کما رأیتمونی اصلی.** تم مجھے جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھو، اسی طرح نماز پڑھو۔اس سے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کا استحباب معلوم ہوا۔اور جو روایتیں آتی ہیں کہ: ایک کپڑے میں نماز جائز ہے۔تو ہم بھی جواز کے قائل ہیں، یہاں بات جواز کی نہیں بلکہ استحباب اور ادب کی ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جگہ جگہ کفار و نصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا، جیسے افطار میں جلدی کرنے کا حکم دیا، یہود جوتا پہن کر نماز نہیں پڑھتے تھے تو نبی ﷺ نے مسلمانوں کو یہود کی مخالفت میں جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز قرار دیا۔اسی طرح جاننا چاہئے کہ نصاریٰ ننگے سر عبادت کرتے ہیں، چنانچہ ہم پر ضروری ہے کہ ہم ان کی مخالفت میں سر ڈھانپ کر نماز پڑھیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ شریعت کا مزاج دیکھیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ نے دریافت کیا کہ: آدمی احرام کی حالت میں کیا کیا پہن سکتا ہے؟ تو نبی ﷺ نے اسے جواب دیا کہ: قمیص نہ پہنے، عمامہ نہ پہنے اور پائجامہ نہ پہنے۔بخاری (134) اس میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ: عمامہ نہ پہنے یعنی سر نہ ڈھانکے، اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ عام حالتوں میں جیسے نماز وغیرہ عبادات میں سر کو ڈھانک لینا چاہئے۔

علامہ شعرانیؒ نے ''کشف الغمہ'' (1/70) میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: جب تم نماز کے لئے آؤ تو سر ڈھانک کر آؤ۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ننگے سر نماز نہیں پڑھنی چاہئے، لیکن اگر ممکن نہ ہو یا کوئی عذر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔مگر بغیر کسی مجبوری اور عذر کے، بلکہ ٹوپی ہوتے ہوئے اسے جان بوجھ کر اتار لینا اور ننگے سر نماز پڑھنا نصاریٰ کا شعار ہے، نبی ﷺ کے شیدائی اور فدائی سے ایسے کام اور فعل کی توقع نہیں کی جا سکتی، اگر اس سلسلہ میں کوئی روایت نہ ہو تب بھی نبی ﷺ کی محبت کا تقاضہ اور اللہ عز وجل کے ادب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بندہ اس کے سامنے اچھے سے اچھے لباس میں جائے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ کہا ہے جن کپڑوں میں وہ لوگوں کے سامنے جانے کو اچھا نہ سمجھتا ہو۔

میں امید رکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی فدائی اپنے عمل (بلا عذر ننگے سر نماز پڑھ کر) سے نبی ﷺ کے شیوہ کی مخالفت نہیں کرے گا، کس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ جان بوجھ کر نبی ﷺ کی مخالفت کرے؟ کیا نبی ﷺ سے محبت رکھنے والے اور حدیث پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کا یہی طرہ ہے کہ نبی ﷺ کے عمل کی مخالفت کرے؟ جب کہ نبی ﷺ کی محبت کا حقیقی تقاضہ یہ ہے کہ آپؐ کے ہر ہر چھوٹے چھوٹے عمل سے بھی شدید محبت ہو۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں

جمہور فقہائے اسلام اور ائمۂ اربعہ حضرت امام مالکؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور امام اہل السنۃ حضرت احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تین طلاقیں ایک مجلس میں ایک وقت میں دی جائیں یا تین مجلس میں تین وقتوں میں، بہر صورت تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ بعض اہلِ ظاہر اور آخری دور میں حضرت علامہ ابن تیمیہؒ کا مسلک یہ رہا کہ تین طلاقیں اگر ایک مجلس میں ایک وقت میں دی جائیں تو اس سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے علم وفضل کے اعتراف کے ساتھ میں بلا جھجک کہوں گا کہ اس مسئلہ میں حضرت العلام سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے، وہ اس غلطی پر بھی ماجور ہوں گے، لیکن اس مسئلہ میں اُن کی تقلید کرنا حرام ہوگی، کیونکہ اُن کا غلط موقف پر ہونا ثابت ہو چکا ہے، پھر بھی اسی پر جمے رہنا اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن افسوس اُن لوگوں پر ہے جو اس وقت موجود ہیں، جن کے سامنے حق بیان کیا جاتا ہے، لیکن وہ پھر بھی ماننے کو تیار نہیں بلکہ اِسے اپنے بنائے ہوئے عقیدہ میں شامل کئے بیٹھے ہیں۔ جب کہ سچی بات بلا تکلف عرض ہے کہ: وہ لوگ جو غصہ کی حالت میں تینوں طلاقیں ایک ساتھ دے بیٹھتے ہیں، انھیں ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اُن لوگوں (تین طلاق کو ایک ماننے والوں) کے پاس سے فتویٰ حاصل کریں اور اُن کے فتویٰ پر عمل کر کے پھر سے اپنی مطلقہ بیوی کو گھر لا کر ازدواجی زندگی گذاریں۔

یہ مسئلہ بہت ہی نازک ترین ہے، اس کا تعلق نہ صرف حلال وحرام سے ہے، بلکہ تینوں طلاقیں دی ہوئی عورت کو دوبارہ اپنے پاس رکھنے سے نہ صرف آدمی

حرام کاری میں مبتلا ہوگا، بلکہ اس بے احتیاطی کے اثرات نسلوں پر بھی پڑیں گی، کیونکہ تینوں طلاق دی گئی عورت کو بغیر حلالہ کے گھر میں رکھنا حلال نہیں، تو اس سے جو حرام اولادیں پیدا ہوں گی، اُن میں صلاح وفلاح کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

طلاق ایک بامقصد عمل ہے، اسی لئے شریعت نے اس کے کچھ اصول اور ضابطے مقرر کئے ہیں، مثلاً میاں بیوی میں اختلاف کے وقت صلح صفائی کی ہر ممکن کوشش کرنا، آخری حربہ کے طور پر طلاق کے استعمال کی اجازت ہے۔ لیکن اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ: ایسے پاکی کے زمانے میں جس میں جماع (Sex) نہ کیا گیا ہو، ایک طلاق دی جائے، یا تین طہر میں الگ الگ تین طلاقیں دی جائیں۔ دو طلاقوں تک مرد کو رجعت کا اختیار رہتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی طلاق واپس لے سکتا ہے، لیکن تیسری طلاق کے بعد رجعت کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، خواہ یہ تینوں طلاقیں ایک مجلس میں یکبارگی دی گئی ہوں یا الگ الگ۔

طلاق کی اس قانونی حیثیت کے بارے میں ہمیں بھرپور رہنمائی اُس حدیث سے ملتی ہے جو ابوداؤد (2197) میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے منقول ہے کہ: پہلے جب مرد اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو اسے رجوع کرنے کا اختیار رہتا تھا، چاہے اس نے تین طلاقیں دے دی ہوں، لیکن اسے منسوخ کر دیا گیا اور اللہ نے فرمایا: الطلاق مرتان . کہ طلاق رجعی صرف دو ہی ہیں۔ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

اس سے صاف صاف معلوم ہوا کہ جس طلاق کے بعد آدمی کے پاس رجوع کرنے کا اختیار رہے وہ صرف دو طلاقیں ہیں، تیسری طلاق ہاتھ سے نکل جانے کے بعد واپس نہیں آسکتی، چاہے یہ سب ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ، قرآن وحدیث میں کہیں اس کی تفریق موجود نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کا یہ قانون اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تیسری

طلاق کے بعد مرد کو رجعت کا اختیار نہ رہے، کیونکہ اگر ہم تین کے بعد بھی رجعت کو ثابت مانیں گے تو اس کے منسوخ ہونے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اور یہ صراحتاً قرآنی آیت کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن کا کہنا ہے: الطلاق مرتان۔ کہ طلاق رجعی صرف دو ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں ہی کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ نبی ﷺ نے تینوں طلاقوں کو اعلانیہ طور پر نافذ کیا۔

صحیح بخاری میں حضرت امام بخاری نے ایک عنوان قائم کیا ہے ''تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا بیان'' اور اس باب کے تحت مشہور صحابی حضرت عویمر عجلانیؓ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ لعان سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا: میں اگر اب اِس عورت کے ساتھ رہوں تو جھوٹا کہلاؤں، پھر انھوں نے نبی ﷺ کے حکم فرمانے سے پہلے ہی بیوی کو تین طلاقیں دے دی۔ (5259)

ابوداؤد (2252) میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ: پس عویمر عجلانیؓ نے نبی ﷺ کے سامنے تین طلاقیں دے دی جنھیں نبی ﷺ نے نافذ فرمایا، اور جو کام نبی ﷺ کے سامنے کیا جائے وہ سنت ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوی میں حضراتِ صحابہ تین طلاقیں دیتے تھے اور خود جناب نبی ﷺ نے اس کو نافذ فرمایا، یہاں تین طلاقیں دینے پر نبی ﷺ کا حضرت عویمرؓ کو منع نہ کرنا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ تین طلاقوں کا واقع ہو جانا معروف و مشہور تھا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی، عورت نے دوسرا نکاح کر لیا، پھر دوسرے شوہر نے (جماع -Sex- سے پہلے) ہی طلاق دے دی، اس نے پوچھا: کیا وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہو گئی؟ آپؐ نے جواب دیا: نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس دوسرے شوہر کے مزے کو چکھ لے جیسا کہ پہلے کے مزے کو چکھا ہے۔ بخاری (5261) اس میں بھی

نبی ﷺ نے تین طلاقوں کے بعد بغیر شرعی حلالہ کے بیوی کو پہلے (طلاق دینے والے) شوہر کے لئے حرام قرار دیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک وقت میں تین طلاقیں دینے سے تینوں ہی طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

حضرت عبادہ بن الصامتؓ کے والد نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی، نبی ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے تین نافذ کر دی اور نو سو ستانوے کو لغو اور ظلم قرار دیا۔ مصنف عبدالرزاق (11339)

حضرت ابن عمرؓ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ: میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دوں تو کیا مجھے رجوع کا حق حاصل رہے گا؟ نبی ﷺ نے جواب دیا: نہیں! اس سے تمہاری بیوی بائنہ ہو جائے گی اور یہ گناہ کا کام ہوگا۔ دار قطنی (4019)

اِن کے علاوہ روایتوں کی ایک لمبی فہرست ہے جن سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے واقعات نبی ﷺ کے سامنے بھی پیش آئے اور نبی ﷺ نے اُن تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، آپؐ کے بعد صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا بھی یہی فتویٰ رہا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے پہلے مختلف تھی لیکن جب ان کے سامنے حقیقت کھل کر آئی تو وہ بھی تین طلاقوں کو تین ہی ماننے لگے جیسا کہ ابوداؤد (2198) میں ہے کہ: حضرات ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا گیا کہ: اگر کسی کو اس کا شوہر تین طلاقیں دے دے تو؟ ان سبھوں نے جواب دیا: بغیر حلالہ کے وہ پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوتی۔

اگر تین طلاقوں کے بعد بھی رجعت کا اختیار ہوتا تو حلالہ کی ضرورت نہ رہتی، کیونکہ حلالہ کی ضرورت تین طلاقوں کے نافذ ہونے کے بعد پڑتی ہے، ایک طلاق یا دو طلاق کے بعد نہیں، یعنی حلالہ اس وقت ضروری ہوتا ہے جب رجعت کا

اختیار نہیں رہتا، اگر تین طلاقوں کے بعد بھی رجوع کرنا ممکن ہوتو حلالہ کی ضرورت نہیں، یہاں پر اِن سبھی حضرات صحابہ نے حلالہ کا حکم دیا، جس سے پتہ چلا کہ تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی اور تینوں نافذ ہوں گی اور تین کے بعد رجعت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

میری بات اس سلسلہ میں پوری ہوچکی اور یقیناً آپ اِن صحیح وصریح احادیث کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچ چکے کہ: تین طلاقیں خواہ ایک مجلس اور ایک وقت میں ہوں یا کئی مجلس اور کئی اوقات میں، بہرصورت وہ تین ہی شمار ہوں گی، اس کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہتا، بلکہ عورت اُس شوہر سے اس وقت تک جدا ہوجائے گی جب تک کہ وہ حلالہ کے مرحلہ سے نہ گذر جائے۔

لیکن.... ابھی آپ کے ذہن میں حضرت رکانہ ابن عبد یزیدؓ کی روایت سے مغالطہ ہورہا ہوگا کہ: انھوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دی اور نبی ﷺ نے اس کو ایک طلاق رجعی ہی قرار دیا (یعنی ان کو رجوع کرنے کی گنجائش دی اور ان کی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا)

اب آپ ذرا اپنے ذہن کو حاضر رکھ کر اس حدیث کو سمجھیں کہ: یہ حدیث دو طرح مروی ہے جیسا کہ حضرت امام ابوداؤد سجستانیؒ اپنی سنن (2208) میں فرماتے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ: یہ روایت دو طریقہ سے مروی ہے، ایک طریق میں ابن جریج ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں کہ ''رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی'' اور دوسرا طریق جس میں رکانہؓ کے لڑکے روایت کرتے ہیں، اس میں ہے کہ ''رکانہ نے اپنی بیوی کو البتہ سے طلاق دی''۔ جب البتہ (یعنی یقینی طور پر تمہیں طلاق) والی بات نبی ﷺ کو بتائی گئی تو نبی ﷺ نے ان سے ان کی نیت دریافت کی؟ انھوں نے جواب دیا: ایک۔ اس پر نبی ﷺ نے ان سے قسم لی، جب انھوں نے قسم کھالی تو

نبی ﷺ نے فرمایا: وہی مراد ہے جو تم نے ارادہ کیا ہے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں: یہ ''البتہ'' والی روایت جریج کی روایت (جس میں تین کا لفظ موجود ہے) سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ''البتہ'' کا لفظ نقل کرنے والے خود طلاق دینے والے کے گھر والے حضرات ہیں، اور گھر والے گھر کی بات زیادہ بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت رکانہ نے تین طلاقیں نہیں دی تھی، بلکہ ''البتہ'' کا لفظ کا استعمال کیا تھا، پھر آپ غور کریں کہ نبی ﷺ نے ان سے قسم لی، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اگر رکانہ کی مراد تین ہوتی تو نبی ﷺ اُن تینوں کو نافذ فرمادیتے، جب ہی تو آپ ﷺ قسم لے رہے تھے۔

جیسا کہ آپ سنن ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے جان چکے ہیں کہ پہلے تین طلاقوں کے بعد رجعت کا اختیار ہوتا تھا لیکن یہ حکم منسوخ ہوگیا، یہ الگ بات ہے کہ بعض صحابہ کو اس حکم کی منسوخی کا علم نہ ہوسکا، جس طرح متعہ (فِکس وقت کے لئے نکاح کرنا) منسوخ ہوا تو بعض صحابہ کچھ زمانے تک اس سے واقف نہ ہوسکے، اسی طرح تین طلاقوں کو ایک ماننے کا حکم بھی منسوخ ہوچکا تھا، لیکن تمام لوگوں کو اس کا علم نہ ہوسکا، پھر حضرت عمرؓ نے اس حکم کا باقاعدہ اعلان فرمایا کہ: اب تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔

ملاحظہ کریں! ابوالصہباءؒ نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ: لوگ تین طلاقوں کو نبی ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے ابتدائی دور میں ایک کہتے تھے، لیکن عمرؓ نے خطبہ دیا: لوگو! تم نے طلاق کی بہت کثرت کردی، اب آئندہ جو شخص جیسا بولے گا ویسا ہی سمجھا جائے گا۔ مصنف عبدالرزاق (11338)

اس روایت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا کہ واقعہ یہ تھا کہ لوگ پہلے

طلاق کا لفظ کئی مرتبہ بول کر تاکید مراد لیتے تھے، چونکہ وہ زمانہ سچائی اور اخلاص کا تھا، اس لئے تاکید کی نیت پر طلاق بھی ایک ہی شمار ہوتی تھی، لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ کثرت سے اس کا استعمال کرنے لگے اور پوچھنے پر کہہ دیتے کہ: ہماری مراد تو تاکید تھی۔ چونکہ پہلے کی طرح سچائی اور دیانت باقی نہیں تھی اس لئے حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا کہ: اب آئندہ ظاہری الفاظ کا اعتبار ہوگا، نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ چنانچہ تمام صحابۂ کرام کا اس پر اجماع واتفاق بھی ہوگیا اور کسی نے اس پر نکیر نہ کی، لہٰذا یہ حکم قطعی ہوگا۔

کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کو محض وقتی فیصلہ اور انتظامی حکم قرار دینے کی جرأت کرتے ہیں، جب کہ اس کا کوئی سر پیر نہیں ہے، کیونکہ: علماء سلف میں سے کسی نے اس کو وقتی فیصلہ نہیں کہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ: حلال وحرام کے مسئلہ میں نبی ﷺ کے بعد کسی کو کوئی فیصلہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اور آپ جان چکے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں بھی ایسے واقعات پیش آئے جنھیں نبی ﷺ نے تین طلاق قرار دیا، حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ کے اُن ہی فیصلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حکم نافذ کیا ہے، اپنی رائے سے نہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نبی ﷺ کے بعد صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کا اس بات پر اجماع ہوتا چلا آرہا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، ایک نہیں۔ لیکن جب علامہ ابن تیمیہؒ کے مسلک کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے سلف کے متفقہ فیصلہ سے ہٹنا شروع کیا تو سعودی عرب کی اعلیٰ ترین فقہی مجلس ''ہیئۃ کبار العلماء'' نے ۱۳۹۳ ہجری میں پوری بحث وتمحیص کے بعد بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ: ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی مانی جائے گی، ایک نہیں۔ گویا موجودہ زمانہ میں بھی امت کا اِسی پر اتفاق اور اجماع ہوا۔

بہت سے لوگ اپنے اِس فاسد موقف پر سورۂ طلاق کی آیت کی محرف تفسیر کرتے ہیں، ہم اُن سے بس اتنا ہی کہنا چاہیں گے: نبی ﷺ کا فرمان یاد رکھیں: جس نے قرآن میں اپنی رائے سے تفسیر کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم بنالیا۔ آپ کی یہ خطرناک روِش درحقیقت دین کو بازیچۂ اطفال بنانے کی سازشیں ہیں، آپ دین کی روح فنا کررہے ہیں، قرآن کریم میں من مانی تفسیر کرکے گمراہی کے ایسے خطرناک دروازے کھول رہے ہیں جس کے نتائج بہت بہت خطرناک ہیں۔ خدا کے واسطے کچھ تو خوف الٰہی پیدا کریں!

رہ گئی بات معاشرہ اور سماج کی..... کہ: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی، وہ عورت بے سہارا ہوگئی۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی خرابیاں بیان کی جاتی ہیں، تو یاد رکھیں: شریعت آپ کے گھر کی چیز نہیں ہے کہ جب چاہا اپنی سہولت کے لئے دین کے حکموں کو بدل دیا، آپ نے پہلے ہی شریعت کے موافق طلاق کا عمل کیوں نہیں اختیار کیا؟ ہم مرکر خاک میں مل جائیں لیکن دین کا حکم اٹل رہے گا، اس میں آپ کو یا ہمیں ذرہ برابر بھی تبدیلی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اِسی طرح اگر مصلحت اور ضرورت کی بات پیدا کی جاتی رہی تو پوری شریعت کا جنازہ ہی نکل جائے گا، آج آپ نے یہ ضرورت پیدا کی، کل کوئی اور اِس سے بڑی ضرورت پیدا کرے گا، اور ضرورتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑے گا، پھر دین آپ کے گھر کا کھلونہ اور آپ اِسے اپنی خواہشات پر چلانے والے۔

معاشرہ کی اصلاح ایسے نہیں ہوگی کہ تین طلاقوں کو ایک مانا جائے، اگر آپ معاشرہ کی اصلاح ہی چاہتے ہیں تو اپنی عوام کو سمجھایئے کہ طلاق دینے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ: جس طہر (حیض سے پاک ہونے کے زمانے میں) جماع نہ کیا ہو، اس میں ایک طلاق دے کر اسے تین طہر تک چھوڑ دیا جائے عورت خود بائنہ ہوجائے گی۔ اور خواہ مخواہ اپنے اس فاسد اور انتہائی غلط نظریہ کو عوام کے سر تھوپنے کی کوشش نہ کریں۔

وسیلہ اور توسل

جن گنے چنے مسائل میں کچھ لوگوں نے تضلیل وتفسیق (دوسروں کو گمراہ اور فاسق کہنے) بلکہ تکفیر (کافر کہنے) کا بازار گرم رکھا ہے، ان میں سرِ فہرست ''توسل اور وسیلہ'' بھی ہے، یا تو اُن لوگوں نے توسل کی حقیقت کو نہیں سمجھا یا سمجھا تو جان بوجھ کر ناسمجھ لوگوں کی جماعت میں شامل ہوگئے۔

توسل کے معنی ہیں قریب ہونا، ہر اس چیز کو وسیلہ کہا جاتا ہے جو مقصود تک پہونچنے کا ذریعہ بن جائے۔اس توسل کی کئی صورتیں ہیں، میں ہر ایک صورت کو کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

اپنے نیک اعمال سے توسل: یہ بالاتفاق جائز ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان: وابتغوا الیہ الوسیلۃ. مائدہ(35)اس کی جانب وسیلہ تلاش کرو۔اکثر و بیشتر مفسرین نے مستند حوالوں سے ''وسیلہ'' کا مطلب نیک عمل بیان کیا ہے۔

اور..احادیث میں ان تین لوگوں کا واقعہ بہت مشہور ہے جو غار میں پھنس گئے تھے تو ان میں سے تینوں نے اپنے اپنے کئے ہوئے نیک عمل کے وسیلہ سے دعاء کی تو اللہ نے تینوں کے لئے غار کا دہانہ کھول دیا اور انھیں اِس سے نجات ملی۔

کسی زندہ شخص سے دعاء کی درخواست کرنا:

یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعاء کو قبولیت سے نوازیں گے،ان سے درخواست کرنا کہ وہ ہمارے لئے دعاء کردیں، یہ صورت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور اچھا بھی ہے، خیر القرون میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔

مقبول بندوں کے ذریعہ توسل:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی گویا یہ کہتا ہے کہ: یا اللہ! میں فلاں بندہ کو اچھا گمان رکھ کر مقبول سمجھتا ہوں، میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں کہ آپ کی بارگاہ میں پیش کروں،لیکن آپ کا وہ بندہ چونکہ آپ کی خصوصی رحمتوں کے سایہ میں ہے اس لئے میں ان کے وسیلہ سے آپ سے سوال کرتا ہوں۔

زندہ لوگوں سے اس طرح کا وسیلہ اختیار کرنا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(1) یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ توسل کے بغیر دعاء ہی قبول نہیں ہوگی۔

(2) یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ وسیلہ کے ساتھ کی گئی دعاء کو اللہ تعالیٰ لازماً قبول کرہی لیں گے۔

فقہ کی کتابوں میں اور جہاں کہیں بھی یہ لکھا ہوتا ہے کہ: وسیلہ سے دعاء کرنا مکروہ ہے، اچھا نہیں ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ضروری سمجھنا یا اس کو لازم سمجھ لینا یا یہ سوچنا کہ اللہ پر ایسی دعاء کا قبول کرنا لازم ہے، یہ غلط ہے۔

ذات کا توسل:

کسی مقبول بندہ کی ذات کے توسل سے اللہ سے دعاء کرنا، یہ بھی اُن مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ درست ہے۔روایت ہے کہ: ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ: اللہ سے دعاء کردیں کہ اللہ میری بینائی کو واپس کردے.........نبیؐ نے انھیں دو رکعت نماز پڑھنے کو کہا اور اس کے بعد اِس دعاء کا حکم کیا: اے اللہ! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور محمد ﷺ کے وسیلہ سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، آپ کے نبی جو نبیؐ رحمت ہیں۔(یہ دعاء کرنے کے بعد اس شخص نے نبی ﷺ کی جانب متوجہ ہو کر کہا) اے محمدؐ ! میں آپ کے وسیلہ سے اپنی اس دعاء کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ میری دعاء قبول فرمالیں۔اے اللہ! محمد ﷺ کی شفاعت میرے حق میں قبول

فرما۔ابن ماجہ(1385) شیخ البانیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی ذات کو وسیلہ بنانا درست ہے۔

اسی طرح بخاری(1/526) میں روایت ہے کہ: حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب قحط پڑتا تو وہ نبیﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے توسل سے بارش کی دعاء فرماتے تو بارش ہو جاتی تھی۔

اس حدیث سے بھی انسان کی ذات سے توسل درست معلوم ہو رہا ہے،اور......جب زندہ شخص سے توسل کیا جا سکتا ہے جب کہ ابھی اس زندہ شخص سے غلطیاں اور خطائیں بھی ہوں گی،تو پھر اُن مقبول بندوں سے کیوں نہیں جو اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں؟جن کی زندگی تقویٰ وخوف میں گذری اور اب وہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔اِس روایت کو زندوں اور مُردوں دونوں کے حق میں عام ہی مانا جائے تو بہتر ہے،ورنہ اگر آپ یہ کہیں گے صرف زندہ سے توسل جائز ہے تو کل کوئی اور کہہ دے گا: صرف حضرت عباسؓ سے ہی توسل جائز ہے،اگلے دن کوئی بندہ یہ دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے گا کہ: یہ صرف مدینہ میں رہ کر ہی جائز ہے،کیونکہ یہ عمل حضرت عمرؓ نے مدینہ کے اندر کیا،اس کے بعد کوئی شخص یہ بھی کہنے کا حق لے لے گا کہ: یہ صرف حضرت عمرؓ کے لئے جائز ہے۔اور سب کے پاس یہی بخاری کی حدیث دلیل ہو۔اس لئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ: اس حدیث کو زندہ اور مُردہ دونوں کے ساتھ عام مانا جائے۔اگر آپ اس میں سے کسی کو نکالنا چاہیں اور اِس حدیث کی تخصیص کرنا چاہیں تو آپ کے پاس اس تخصیص کی دلیل کیا ہے؟

توسل بالفعل:

کسی کام سے توسل اختیار کرنا،ذرا اور آگے بڑھیں اور خاص طور پر وہ لوگ نظارہ کریں جو توسل کو مطلق شرک کہہ دیتے ہیں: حضرت اوس بن عبداللہؓ سے

روایت ہے کہ: مدینہ میں سخت قسم کی قحط ہوئی،کچھ حضرات حضرت عائشہؓ کے پاس آئے اور اُن کے سامنے یہ دُکھڑا بیان کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ: نبیﷺ کی قبرِ مبارک کو دیکھ کر اس کے سیدھے میں آسمان کی جانب ایک سوراخ کر دو تا کہ آسمان اور قبر شریف کے بیچ کوئی پردہ نہ رہے،چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بہت زور کی بارش ہوئی۔مقدمہ سنن دارمی(92) علامہ حسین سلیمؒ اسد کہتے ہیں: اس کی سند صحیح ہے۔

حیرت ہے ان لوگوں پر جو شرک کا گولہ برساتے ہیں اور مطلق توسل کو شرک قرار دیتے ہیں،آخر کیا انھوں نے یہ سب حدیثیں نہیں دیکھی؟ اگر حدیثیں دیکھی تو پھر ان کی سمجھ کو کیا ہو گیا؟ اور اگر یہ احادیث ان کی نظر سے نہیں گذری ہیں تو کیا وہ اس لائق ہیں کہ: بغیر علم کے شریعت کا کوئی حکم بیان کریں؟

اب آخر میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی رائے دیکھئے،حضرت عباسؓ کی حدیث جو اوپر بیان کی گئی،اس پر علامہ نے باب باندھا ہے:''نیک لوگوں کے وسیلہ سے بارش مانگنا''اور اس حدیث کی تشریح کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یوں سنایا ہے: حضرت عباسؓ کے اس واقعہ سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ نیک لوگوں اور خاندانِ نبوت کے حضرات سے توسل اختیار کرنا بہتر اور مستحب ہے۔نیل الاوطار(3/233)

اِن تمام باتوں کے بعد پھر وہی سب سے اہم بات باقی رہ جاتی ہے کہ: اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے جس میں افراط وتفریط کی کوئی گنجائش نہیں،کچھ لوگ وسیلہ کو بالکل ضروری قرار دیتے ہیں کہ ان کے یہاں بغیر وسیلہ کے کوئی راہ ہی نہیں،وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ تو اللہ تک پہونچ ہی نہیں سکتے،اللہ نے سارے تصرفات نبیوں اور ولیوں کے قبضہ میں دے رکھے ہیں اور یہ لوگ اپنی اپنی قبروں میں دوسروں کی حاجت روائی کر رہے ہیں،جس طرح بادشاہ خود سارے کام نہیں کرتا بلکہ کچھ کام اپنے ماتحتوں کو دے دیتا ہے،اسی طرح اللہ نے دعاء قبول کرنے

اور حاجت پوری کرنے کا کام ولیوں کے قبضہ میں دے رکھا ہے۔ جب کہ یہ سراسر شرک ہے،اللہ تعالیٰ کو دنیاوی بادشاہ پر قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے جس کی سزا''ہمیشہ ہمیش کی جہنم'' ہے۔

دوسری جانب کچھ لوگ مطلق وسیلہ کو ہی شرک قرار دے رہے ہیں۔فیا للعجب !

جب کہ سلف صالحین کا اس سلسلہ میں معتدل اور محتاط عقیدہ یہ رہا ہے کہ :مقبول حضرات خواہ زندہ ہوں یا دنیا سے جا چکے ہوں،ان سے اچھا گمان رکھتے ہوئے ان کا وسیلہ اختیار کرنا درست ہے،لیکن اسے ضروری سمجھنا صحیح نہیں ہے۔اسی لئے بہت سے مشائخ اور اکابرین نے (جو خود اعلیٰ درجہ پر تھے) کہا ہے کہ: مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنے اور اللہ کے درمیان کسی کو وسیلہ بناؤں۔لیکن اگر مذکورہ شرطوں کے ساتھ وسیلہ اختیار کیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

تراویح بیس رکعات یا آٹھ؟

تراویح دراصل ''ترویحۃ'' کی جمع (Plural) ہے،ترویحہ کہتے ہیں: ایک دفعہ آرام کرنا۔رمضان کی راتوں میں باجماعت نفل نماز ادا کرنے کو تراویح کہا جاتا ہے۔صحابۂ کرامؓ ہر چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا کرتے تھے،اسی مناسبت سے اس کا نام ''تراویح'' (بہت بار آرام کرنا) رکھا گیا۔سوال یہ ہے کہ: تراویح کی رکعات کتنی ہیں؟ کچھ لوگ اس پر مُصِر ہیں کہ نبی ﷺ سے آٹھ رکعت ثابت ہیں، وہ لوگ اس کو ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔آیئے حقیقت کا مطالعہ کریں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: رسول کریم ﷺ نے رمضان کی ایک رات میں مسجد کے اندر تراویح کی نماز پڑھی،لوگ بھی آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہو گئے، دوسری رات کی نماز میں اور زیادہ لوگ جمع ہو گئے، تیسری یا چوتھی رات آپؐ نمازِ تراویح کے لئے تشریف نہ لائے اور صبح کو صحابۂ کرام سے فرمایا: میں نے تمہارا شوق دیکھا، میں اس ڈر سے نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر رمضان میں فرض نہ کر دی جائے۔مسلم (1819)

اس کی متعین رکعات نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے،اس لئے حضرت العلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ: جس شخص کا یہ خیال ہو کہ نبی ﷺ نے تراویح کی کوئی تعداد مقرر کی ہے جس کے اندر کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی، یقیناً یہ اس کی غلط فہمی ہے۔الفتاویٰ الکبریٰ (2/120)

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ: مسئلۂ تراویح کی تمام روایتوں سے تراویح کا باجماعت پڑھنا تو ثابت ہے،لیکن اس میں رکعتوں کی تعداد اور اس میں قرأت کی تعیین نبی ﷺ سے منقول نہیں۔نیل الاوطار (3/64)

نبی ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں لوگ اپنے اپنے طور پر تراویح پڑھا کرتے تھے،اس کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانۂ مبارکہ آیا،جس کے متعلق حضرت عبدالرحمان قاریؒ فرماتے ہیں کہ: میں عمرؓ کے ساتھ مسجد گیا تو دیکھا کہ لوگ مختلف گروپوں میں الگ الگ نمازِ تراویح پڑھ رہے ہیں،کسی کے ساتھ کچھ لوگ بھی شریک ہیں،یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میرا خیال ہے کہ اگر ان لوگوں کو ایک ہی کی اقتداء میں جمع کر دیا جائے تو بہت ہی اچھا ہو،پھر آپؓ نے سب کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کر دیا۔

پھر اگلے دن جب ہم آپؓ کے ساتھ باہر نکلے اور دیکھا کہ سب لوگ ایک ہی کی اقتداء میں نمازِ تراویح ادا کر رہے ہیں تو عمرؓ نے فرمایا: یہ طریقہ بہت ہی اچھا ہے۔موٴطا امام مالک (250)

اب آیئے ذرا وہ روایات ملاحظہ کریں جس میں تراویح کی رکعات کا ذکر ہے۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ: نبی ﷺ نے رمضان میں آٹھ رکعتیں پڑھیں۔صحیح ابن خزیمہ (1070) اس میں ایک راوی حسن عیسیٰ بن جاریہ ضعیف ہیں،ان کے بارے میں علامہ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ: اس کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں،امام ابوداوٴدؒ فرماتے ہیں: اس کے پاس بہت سی منکر روایتیں ہیں۔

موٴطا امام ملک میں ایک روایت میں گیارہ رکعات کا بھی ذکر ہے،حضرت سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو گیارہ رکعات پڑھانے کا حکم فرمایا۔

تو جاننا چاہئے کہ اس روایت کی کیفیت یوں ہے کہ: یہ حدیث تین طرح سے آئی ہے،ایک میں اکیس کا ذکر ہے،دوسری میں گیارہ،تیسری میں تیرہ کا۔ظاہر ہے

اِن تینوں میں سے ایک ہی درست ہے،اور درست وصحیح وہی ہے جس کو موٴطا کی شرح میں علامہ زرقانیؒ نے نقل کیا ہے کہ: علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ: امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے راویوں نے حضرت سائبؓ کی اس روایت میں اکیس کا ذکر کیا ہے اور یہی صحیح ہے،اور میرا غالب گمان یہ ہے کہ گیارہ کا تذکرہ وہم کی بناء پر ہوگیا ہے۔زرقانی (1/354)

دوسری بات یہ ہے کہ بیہقی کے اندر حضرت سائبؓ کی صحیح روایت میں بیس رکعات کا ذکر ہے،جو اس بات کا قرینہ ہے کہ گیارہ کا ذکر وہم کی وجہ سے ہوا ہے۔

حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں ہم لوگ بیس رکعات تراویح اور وتر (الگ) پڑھتے تھے۔بیہقی (4801)

حضرت یزید بن رومانؒ کہتے ہیں کہ: لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رمضان کے اندر تئیس رکعات ادا کیا کرتے تھے۔(252)

حضرت علیؓ کے دور میں اسی بیس رکعات کا معمول رہا۔حضرت ابوالخصیبؒ کہتے ہیں: ہمیں سویدؓ بن غفلہ نے رمضان میں پانچ ترویحے یعنی بیس رکعات نماز پڑھائی،اور حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سے شتیر بن شکلؒ رمضان کے مہینے میں بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھایا کرتے تھے۔بیہقی (4803)

ابوالحسناءؒ کہتے ہیں کہ: حضرت علیؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحہ یعنی بیس رکعات نماز پڑھائے۔بیہقی (4805) اس روایت میں ضعف ہے۔

اِن تمام روایتوں کے مجموعہ سے صاف طور پر یہ نتیجہ سامنے آرہا ہے کہ تراویح کی رکعات حضرات صحابۂ کرام کے دور میں بیس تھی۔پھر آپ ''تراویح'' کے لفظ پر غور کریں،یہ ترویحہ'' کی جمع ہے،جس کا مطلب ہے بہت سے ترویحے،عربی زبان میں جمع کا لفظ تین یا تین سے زیادہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے،مثال کے طور

پر ''رجل'' معنی ایک مرد، اس کی جمع ''رجال'' یعنی تین یا تین سے زیادہ مرد۔ اسی طرح ''تراویح'' کے معنی تین یا تین سے زیادہ ترویحے، اور ایک ترویحہ چار رکعت میں ہوتا ہے، تو تین ترویحہ کا مطلب بارہ رکعات، آٹھ رکعات کا معنی تو اس لفظ سے کسی بھی طرح ثابت نہیں ہوسکتا، کم سے کم بارہ، لیکن بارہ رکعات احادیث سے ثابت نہیں بلکہ بیس ثابت ہے، اسی لئے ''تراویح'' کے لفظ میں بھی غور کرنے سے بیس ہی رکعات کا ثبوت ملتا ہے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: جمہور اہلِ علم کا مسلک وہی ہے جو حضرت علیؓ وعمرؓ اور دیگر (عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ) سے منقول ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ، ابن مبارکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے مکہ والوں کو بیس رکعات ہی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ترمذی (806)

مشہور عالمِ اسلام حضرت علامہ ابن قدامہؒ کا فیصلہ دیکھ لیں، وہ لکھتے ہیں: امام احمدؒ کے یہاں پسندیدہ عمل بیس رکعت ہے، حضرت سفیان ثوریؒ بھی یہی فرماتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ: جب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو ابی بن کعبؓ کی امامت میں جمع کیا تو وہ بیس رکعات پڑھا کرتے تھے، نیز امام احمدؒ کا استدلال حضرت یزیدؓ بن رومان اور حضرت علیؓ کی روایت سے ہے۔ پھر ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ: یہ اجماع کے درجہ میں ہے۔ اور جس چیز پر حضورﷺ کے صحابہ عمل کرتے ہوں، وہی اتباع کے لائق ہے۔ المغنی (3/389)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: تراویح کے سنت ہونے پر تمام علماء کا اجماع ہے اور یہ بیس رکعات ہیں جن میں ہر دو دو رکعات کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ الاذکار (183)

حضرت علامہ ابن تیمیہؒ نے ''فتاویٰ کبریٰ'' (2/119) میں ''جن مسائل میں لوگ شبہ میں پڑ جاتے ہیں'' کے اندر تراویح کی رکعات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ: جب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا تو وہ بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھتے تھے۔

پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں اور کیا ہی بہتر فیصلہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی امامت میں جمع کیا، اور حضرت عمرؓ خلفاء راشدین میں سے ہیں جن کے متعلق نبیﷺ نے فرمایا ہے کہ: میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین (ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ) کی سنت پر عمل کرو اور اسی کو ڈاڑھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔ فتاویٰ کبریٰ (2/98) اور پہلے معلوم ہو چکا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس رکعات تراویح پڑھی جاتی تھی۔

مکہ مکرمہ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ سے آج تک بیس رکعات کا ہی معمول چلا آرہا ہے، کسی بھی دور میں حرم شریف کے اندر بیس سے کم رکعات پڑھنا تاریخی طور پر ثابت نہیں، عرب کے مشہور عالم دین، مسجد نبوی کے مدرس اور مدینہ منورہ کے قاضی شیخ عطیہ سالم نے نماز تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی میں ایک رسالہ **''التراویح اکثر من الف عام''** کے اندر تاریخی حقائق کی روشنی میں لکھا ہے کہ: خلافتِ راشدہ اور حضرات صحابہ سے لے کر اب تک حرمین میں بیس ہی رکعات پڑھنے کا معمول ہے۔ اس کے بعد آخر میں انھوں نے جو سوال کیا ہے، میں اس سوال کو یہاں دُہرانا چاہوں گا جو میری اس پوری بحث کا خلاصہ ہوگی:

کیا کسی صحابی یا ماضی کے کسی بھی ایک عالم نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ آٹھ رکعات سے زیادہ تراویح درست نہیں؟ جب پورے چودہ سو سال میں ایک بھی قابلِ ذکر شخص ایسا نہیں ملتا جس نے ایسا فتویٰ دیا ہو، نہ ہی یہ ثابت ہے کہ مسجد نبوی میں

با جماعت تراویح صرف آٹھ رکعات ادا کی گئی ہیں، تو پھر جو لوگ آٹھ رکعات پر اَڑے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں، ہم اُن سے صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے زمانے سے لے کر اب تک کے مسلمانوں کے طریقہ پر عمل کرنا زیادہ صحیح ہے یا آپ کی سمجھ اور آپ کے قول پر؟ جب کہ صحابۂ کرام اور حضرات سلف ہم اور آپ سے علم میں لاکھوں گُنا بڑھے ہوئے ہیں، ہمارا علم تو اُن کے علم اور ان کی سمجھ کا محتاج، پھر یہ کیسی دانائی کہ ہم اُن ہی کو چیلنج کریں.......؟

اب میں نبی ﷺ کے فرمان ''دین خیر خواہی کا نام ہے'' کے پیشِ نظر ایک اہم بات کہنا چاہوں گا کہ: رمضان جیسے بابرکت مہینہ میں اللہ کی رحمت کا سمندر جوش میں رہتا ہے، جس میں ایک نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ہو جاتا ہے، اللہ اس سے بھی زیادہ جس کو دینا چاہیں، لہٰذا اس موقع کو غنیمت جان کر اس میں موتیاں جمع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اِس موقع پر بھی اگر کوئی شخص سستی کرے یا گروہی تعصب میں مبتلا ہو کر اس سعادت سے محروم رہے اور کم تعداد پر ہی اکتفاء کر کے اللہ کے سامنے بے نیازی کا ثبوت دے، اس کا خدا ہی خیر کرے۔ قیامت کے دن اا ایک ایک نیکی کی اہمیت سمجھ میں آئے گی، آپ آٹھ رکعات کی نیکیاں دیکھیں اور بیس رکعات کی۔

ایک اہم بات کا دھیان رہے کہ اس میں اِخلاص ہونا چاہئے، صرف ختم قرآن مقصود نہ ہو، صرف بیس رکعات پوری کرنے کے چکر میں قرآن کریم کی روحانیت کا جنازہ نہ نکالا جائے کہ: پڑھنے والا ہی جانے کہ کیا پڑھا جا رہا ہے، جب کہ نبی ﷺ نے قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم فرمایا۔

گذشتہ سطور سے یہ بات اچھی طرح نکھر کر سامنے آگئی کہ صحابہ کرام سے لے کر اب تک کے تمام مسلمان بیس رکعت تراویح پڑھتے آئے ہیں، لہٰذا اسی کو اپنانا

چاہئے اور یہی اتباع و تقلید کے زیادہ لائق ہے، یہی سیدھا راستہ ہے۔ آرام و راحت کے خیال سے آٹھ پر اکتفاء کرنا نبی ﷺ کے شیدائی کا کام نہیں، رسول اللہ کی حدیث ''میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو'' پر عمل کرنے والے کا یہ کام نہیں کہ اس میں سستی کرنے کے لئے یہ بہانہ اور حیلہ تراشے کہ بیس رکعات تو حضرت عمرؓ کے دور میں شروع ہوئی ہے۔

کیسی عجیب اور نرالی منطق ہے یہ؟ جماعت سے تراویح کا باضابطہ اہتمام بھی تو حضرت عمرؓ کے زمانہ سے ہی ہوا ہے، (واضح رہے کہ نبی ﷺ نے بھی جماعت سے تراویح پڑھائی لیکن اس کو باضابطہ ادا نہیں کیا) آپ حضرت عمرؓ کی ایک سنت کو لے رہے ہیں اور دوسری سے کنارہ کش۔ اللہ سے محبت رکھنے والوں کا یہ کام نہیں، نماز کے بارے میں تو اللہ نے فرمایا ہے: **وانها لكبيرة الا على الخاشعين** . یہ نیک لوگوں کے علاوہ سب پر بھاری ہے۔ اس لئے چاہئے کہ ہم اس کو اپنے اوپر گراں اور بوجھ نہ بنائیں بلکہ خوش دلی سے اس کو ادا کریں اور پوری بیس رکعات انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ۔ **اللهم وفقنا لما تحب وترضىٰ**.

اہلِ حدیث کون ہیں؟

اہلِ حدیث کون لوگ.....؟؟

اہلِ حدیث وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کو تلاش کیا اور اس پر عمل کیا اور نبی ﷺ کی سنتوں پر عمل کر کے اللہ کی نزدیکی حاصل کی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے مشرق ومغرب چھان ماری۔ تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبه(80)

اہلِ حدیث میں بہت سے لوگ عالم، کچھ فقیہ، کچھ خطیب اور اچھی باتوں کا حکم کرے، برائیوں سے روکنے والے ہیں۔ اللہ نے انھیں شریعت کا رکن بنایا، ان کے ذریعہ بری بدعتوں کو ختم کیا، وہ لوگ اللہ کی مخلوق میں اللہ کے امین ہیں اور نبی ﷺ اور امتی کے درمیان واسطہ ہیں، جو نبی ﷺ کی ملت کی حفاظت میں کوشاں (کوشش کرنے والے) ہیں، جن کی روشنیاں پوری دنیا کو منور (روشن) کر رہی ہیں، جن کے مذہب غالب ہیں، جن کی دلیلیں مضبوط ہیں، جو خواہشات کو اپنا معبود نہیں بناتے، جو لوگوں کی بھانت بھانت کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے، صرف اُن سے وہی باتیں قبول کرتے ہیں جو نبی ﷺ سے منقول ہو اور آپ کی تعلیمات کے موافق ہو، وہ دین کی حفاظت کرنے والے اور اس کے داروغہ ہیں، علم کے خزانے اور اس کے حامل (اٹھانے والے) ہیں، جب حدیث میں اختلاف ہوجائے (دوطرح کی حدیثیں آجائیں) تو ان ہی کا فیصلہ قبول کیا جائے گا، یہ حضرات جو فیصلہ کریں گے اسی فیصلہ کو سن کر عمل کیا جائے گا، اُن میں سے ہر ایک عالم اور فقیہ ہیں، زاہد اور اللہ کے قریب ہیں، وہ لوگ جمہور یعنی امت کے بڑے طبقے ہیں، ان ہی کا راستہ سیدھا ہے، ہر وہ شخص جو اِن لوگوں کی مخالفت کر کے کوئی

نئی بات لے کر کھڑا ہوا اُسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا، جو ان کے ساتھ بدتمیزی کرے گا اللہ اسے تہس نہس کر دیے گا، جو ان سے دشمنی رکھے گا اللہ انھیں رسوا اور ذلیل کرے گا، جو اُن کے راستہ سے ہٹے گا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔شرف اصحاب الحدیث للخطیب بغدادیؒ(4)

اہلِ حدیث وہ لوگ ہیں جو صحابۂ کرام کی پیروی کرنے والے ہیں، نبی ﷺ کی سنت اور صحابہ کے طریقے کو جاننے والے، اُن کی پیروی کرنے والے، یہی لوگ مخلوق میں سب سے افضل ہیں. العقيدة الاصفهانيه(1/156)

اہلِ حدیث وہ لوگ ہیں جو نبی ﷺ کی اتباع کرنے والے ہیں، وہ لوگوں میں سب سے زیادہ نبی ﷺ کی باتوں، آپ کے کام اور آپؐ کے احوال سے باخبر ہیں، صحیح اور غیر صحیح روایت کے درمیان فرق کرنے والے، اس کے معانی کو جاننے والے اور دل سے اسے سچا جان کر اس پر عمل کرنے والے، نبی ﷺ سے محبت رکھنے والوں سے محبت کرنے والے، آپؐ کے دشمنوں سے دشمنی رکھنے والے......اللہ کی صفات اور تقدیر کے سلسلہ میں جو الفاظ آئے ہیں، اور لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے، اس کو اللہ کے سپرد کرنے والے، جو معنی قرآن وحدیث کے موافق ہو اس کو قبول کرنے والے، خواہشات کی پیروی سے بچنے والے ہیں۔مجموع الفتاویٰ(3/347)

الحمد للہ! تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں (ائمۂ اربعہ کے مقلدوں) کو اہلِ حدیث میں سے بنایا، جس نے ہمیں ''سوادِ اعظم'' (امت کے بڑے طبقہ) میں شامل رکھا۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اہلِ حدیث کی جس قدر تعریفیں کی گئی ان سب کے مصداق ائمۂ اربعہ اور ان کے مقلدین ہیں، اور کامل ومکمل طور پر یہی لوگ اِن سب کے مصداق ہیں، یہی اہلِ حدیث ہیں اور انھیں کے پیروکار اہلِ حدیث ہیں۔

کیا نام دوں اُنھیں؟

اگر کوئی شیعہ یا رافضی اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہنے لگے تو کیا آپ اسے اہلِ حدیث تسلیم کرلیں گے؟ نہیں! کیوں کہ اس کا عمل اہلِ حدیث کے عمل سے الگ ہے، اس کا عقیدہ اہلِ حدیث کے عقیدہ سے مختلف ہے، ٹھیک اسی طرح اگر کچھ لوگ سلفِ صالحین اور اکابرینِ امت (امام مالکؒ وشافعیؒ وابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کے موقف سے ہٹ کر کوئی الگ راہ اختیار کئے ہوا ہو، بار بار اس کے کانوں میں حق کی آواز پہونچ رہی ہو تو کیا اسے اہلِ حدیث کہا جائے گا؟ اہلِ حدیث کا مطلب تو یہ ہے کہ: ایک موضوع پر جتنی روایات ہیں سب کو جمع کیا جائے، صحیح اور غیر صحیح میں فرق کیا جائے، ممکن ہو تو سب کو جمع کرکے عمل کرنے کوشش کی جائے نہیں تو کسی ایک کی ترجیح ثابت ہو تب اس پر عمل کیا جائے، اہلِ حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ: بخاری کی ایک حدیث اٹھائی، اس پر عمل کیا، باقی تمام احادیث خواہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی کیوں نہ ہوں، سب کو پسِ پشت ڈال دیا، پھر نعرہ لے کر کھڑے ہوئے: ہم ہی اہلِ حدیث۔

میں اُنھیں اہلِ حدیث کیسے کہوں جب کہ: صحیح حدیث میں ہے کہ: اللہ کی ذات میں کھوج وکرید نہ کرو۔ اور وہ ہیں کہ: اللہ کو عرش پر بٹھانے پر تُلے ہوئے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عرش اللہ سے بڑا ہوگا، کیونکہ بڑی چیز چھوٹی چیز میں سما نہیں سکتی، جب عرش ہی اللہ سے بڑا ہو جائے گا تو پھر اللہ نے جو جگہ جگہ کہا: اللہ اکبر۔ اللہ سب سے بڑا ہے، تو یہ غلط ہی ہوگا کیونکہ یہاں تو عرش اللہ سے بڑا ہو گیا ہے؟

میں اُن لوگوں کو کیسے اہلِ حدیث تسلیم کروں جن کے سامنے صحیح حدیثیں آچکی کہ: امام کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے۔ لیکن وہ ہیں کہ مرجوح ومنسوخ حدیثوں کو لے کر بیٹھے ہیں۔

میں کیسے مان لوں اُن لوگوں کو اہلِ حدیث، جو جانتے ہیں کہ: نبی ﷺ سے بلند آواز سے آمین کہنا ثابت نہیں، لیکن یہ ہیں کہ اُسی پر اب تک برقرار ہیں۔

میں انھیں اہلِ حدیث کا مصداق کیسے باور کرلوں جو دیکھ رہے ہیں کہ: حضرت علیؓ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو سنت کہہ رہے ہیں، لیکن یہ لوگ اس کو بھی ماننے کو تیار نہیں۔

میں انھیں اہلِ حدیث کے اعلیٰ مقام پر کیسے مان سکتا ہوں جو جان چکے ہیں کہ: وسیلہ کی جائز قسمیں صحیح روایتوں سے ثابت ہیں، لیکن وہ ہیں کہ مطلقاً اس پر شرک کا لیبل لگائے ہوئے ہیں؟

وہ لوگ کیسے اہلِ حدیث کے معزز تمغہ کے لائق ہو سکتے ہیں جو دیکھ رہے ہیں کہ: ایک مجلس کی تین طلاقوں کو نبی ﷺ نے تین ہی نافذ فرمایا، لیکن وہ ہیں کہ اسے ایک ہی نافذ کرنے کے درپے ہیں۔

وہ لوگ کیسے خود کو اہلِ حدیث کہتے ہیں جنھوں نے نبی ﷺ کی حدیث پڑھ لی کہ: میری اور میرے خلفاء کی سنتوں کو تھامے رہو۔ لیکن یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ کی بیس رکعات تراویح اور حضرت عثمانؓ کی جمعہ کی دو اذانوں کو چھوڑے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ کبھی جھانسہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم محقق ہیں، کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ لیکن ذرا رکئے!: میں اِن کو تقلید سے بچنے والا بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ اور میں انھیں کیسے تسلیم کرلوں؟ جب کہ یہ لوگ سراسر اندھی تقلید میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

کیا انھیں محقق کہوں جو کسی حدیث اور مسئلہ کی تحقیق کے لئے گوگل (Google) سے مدد لیتے ہوں؟ کیا وہ لوگ محقق ہیں جو ٹی وی چینلوں پر ہراڑتی ہوئی بات کو لے کر اپنا مسلک بنالیں؟ کیا تحقیق اسی کا نام ہے کہ آپ کے ایک مولوی نے چاند دیکھ کر اعلان کردیا کہ: کل عید ہوگی، سبھی لوگوں نے اِسے بلا تحقیق

کے مان لیا اور اپنے مولوی کی تقلید کرلی، کیا آپ کے ہر بچے بوڑھے نے خود سے چاند دیکھ لیا؟ آپ تو سرتا قدم اندھی تقلید کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، فرق یہ ہے کہ: مقلدین کہلانے والے لوگ حضراتِ سلف کی تقلید کرتے ہیں اور آپ.....؟ آج کل کے ملاؤں کی۔

اِن میں کا ہر شخص خود کو محقق کہے، یعنی میں کسی کی پیروی نہیں کرتا، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا آپ میں سے ہر ایک شخص ہر ایک مسئلہ کی ازخود تحقیق کرتا ہے؟ کیا وہ ہر مسئلہ کو ازخود حدیث سے ثابت کرسکتا ہے؟

جناب! تحقیق کا مقام تو ایسا بلند ہے کہ ہر شخص اس کی طرف جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کیا آپ میں کا ہر شخص قرآن کریم کو بغیر کسی کی مدد سے سمجھ لیتا ہے؟ سب سے پہلے آپ اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں، لیجئے! کیا دلیل ہے کہ ترجمہ صحیح ہی ہو؟ یہیں پر آپ نے تقلید کرلی۔ تو میں آپ کو محقق کیسے کہوں؟ نہ آپ اہلِ حدیث کے طرز پر ہیں، نہ ہی اہلِ حق کی روش پر ہیں اور نہ ہی سلفِ صالحین کے پیروکار۔ آخر میں آپ کو کیا نام دوں؟

اور سب سے بڑی بلکہ اہم اور بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ: **تقلید کو حرام کہنے والوں کے یہاں سوائے قرآن و حدیث کے کوئی تیسری کتاب نظر ہی نہیں آنی چاہیئے، ورنہ تو اِس طرح کی ساری تیسری کتابوں کو پڑھنے والے سبھی لوگ مقلد کہلائیں گے۔**

خودساختہ مسندِ اِفتاء پر بیٹھ کر.....

دنیا کی تاریخِ ہدایت اور اصلاحِ امت کی نصف گتھیاں صِرف اور صِرف سوءِ فہم (غلط سمجھ) اور باطل تاویلوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ یعنی پہلے لوگوں نے کچھ کہا اور بعد والوں نے کچھ اور سمجھا۔ معتقدین نے غلو (زیادتی) کیا اور مخالفین نے تعصب و تشدد۔ "**ظلمات بعضها فوق بعض**" اور اس تاریکی میں اصل حقیقت روپوش (چھپ) ہوگئی۔ تاریخ عالم کی پرانی سے پرانی گمراہی کا سرچشمہ اگر تلاش کیا جائے تو وہاں بھی سوءِ فہم کا فلسفہ ہی نکلے گا کہ کہنے والوں نے کچھ کہا اور سمجھنے والوں نے کچھ سمجھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوری زندگی توحید و خدا پرستی کی دعوت دی، لیکن ان کے ماننے والوں نے انھیں خدا کہہ کر ساری کج فہمیوں کو انھیں کی جانب منسوب کردیا۔

اللہ و رسول اللہ ﷺ اور فقہاء و محدثین کی باتوں کو سمجھنے کے لئے صافی دل اور مستعد فہم چاہیئے، صرف اسٹیج کی دماغ سوزی اور ٹی وی چینلوں کی دکان آرائی سے یہاں کام نہیں چلتا۔

اگر فقہاء و محدثین سے کسی مسئلہ میں غلطی ہوئی ہے اور یقیناً ہوئی ہے تو اہلِ حق و انصاف نے ان کے عذر کو قبول کیا ہے، مگر:

جو ذوقِ حقیقت سے محروم ہیں اِس لئے ان کا فہمِ نارسا وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔ وہ "رأیت اسدا" کہہ کر شیر کے پنجے اور ناخن تلاش کرنے لگتے ہیں۔

فیا للعقول! جن پاک نفوس کی ساری زندگیاں زہد و تقویٰ، مرتبۂ عرفان و محبتِ الٰہی، اعمالِ صالحہ و حقہ اور ترکِ ماسوی اللہ میں بسر ہوجائیں، ان کی ایک غلطی بھی درخورِ عفو و تاویل نہ ہو (تاویل اور معاف کرنے کے قابل نہ ہو)۔ لیکن جن کی ساری عمریں دنیا سازی و دین بازی و مکر و حیل، فسادِ زور و ہوا پرستی و زہدِ ریائی میں ضائع جائیں، ان کو پورا

حق ہے کہ وہ اپنی خودساختہ مسندِ اِفتاء پر بیٹھ کر کفر وقتل کا فتویٰ لکھیں، اور ائمہ ومحدثین ان کے سامنے پابہ جولاں حربی کفار ومشرکین کی طرح لائے جائیں؟؟

یا سالکا بین الاسنة والقنا انی اشم علیک رائحة الدم

جولوگ حدوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ائمہ ٔ کرام کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، اُنھیں گالیاں دیتے ہیں، اُن کے اوپر افسوس کریں یا ماتم؟ کیا انھوں نے نبی ﷺ کا فرمان نہیں سنا کہ: مؤمن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتل و قتال کرنا کُفر۔ (مسلم) یہ تو عام مؤمنین کو گالی دینے کا حکم ہے، پھر چہ جائیکہ اکابرین امت اور اللہ کے نیک بندوں کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے جائیں؟ جب کہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اللہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے: جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے، میری طرف سے اس کو جنگ کا اعلان ہے۔ کیا ایسے لوگوں میں ہمت ہے کہ وہ اللہ سے جنگ کریں؟ کیا وہ اللہ سے جنگ کر کے صلاح وفلاح پا سکتے ہیں؟ کیا آخرت میں اُن کا کوئی بھی حصہ رہ سکے گا؟ جب کہ اللہ سے لڑائی اور جنگ کا صاف مطلب ہے: خاتمہ کفر پر۔ اللہ اکبر! کتنی خطرناک چیز ہے!

جولوگ اماموں اور اولیاء کرام کو گالی دیتے اور انھیں برا بھلا کہتے ہیں، ایسے لوگوں کو سنبھلنا چاہئے، اب بھی وقت ہے۔ ورنہ اللہ کے ولی سے دشمنی، یعنی اللہ سے جنگ۔ جولوگ اللہ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں، میں ایسے لوگوں کی جرأت اور بے باکی سے خوف زدہ ہوں۔ والسلام